نَهجُ الأَئِمَّة

فِي

اِصلَاحِ الاُمَّة

(ائمہ کی صفات کے بیان میں)

حصہ سوم

ائمہ مساجد کے لیے : علمی فکری تربیتی اصلاحی بیش بہا تحفہ

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

ناشر : مکتبہ احمدیّہ

جامعہ حسینیہ راندیر

مورا بھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمہ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

نَہجُ الْاَئِمَّہ فِیْ اِصْلَاحِ الْاُمَّہ

حصہ سوم

(ائمہ کی صفات کے بیان میں)

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

تفصیلات

نام کتاب : نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ

جامع ومرتب : مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی
(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

تصحیح : (۱) جناب حضرت مولانا خالد صاحب
(استاذ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

(۲) برادر جناب امداد اللہ صاحب احمد آبادی

کمپوزنگ : مولانا ضیاء الرحیم رحیمی (ہدایت آرٹ، سگرام پورہ، سورت)

صفحات : ۱۷۶

اول ایڈیشن : رجب المرجب ۱۴۳۹ھ بمطابق اپریل ۲۰۱۸ء

ناشر : مکتبہ احمدیہ،

جامعہ حسینیہ راندیر
مورابھاگل، راندیر، سورت، گجرات، انڈیا۔

ایلول نزد نور مسجد، ہمت نگر، سابرکانٹھا، گجرات

75750 90455

مختصر فہرست (حصہ سوم)

پیش لفظ

فقیہ عصر جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، اس لیے اللہ کے بھیجے ہوئے دین شریعت سے متعلق تمام کاموں کا مرکز بھی یہی مسجدیں ہیں، نماز باجماعت اور اعتکاف تو ایسا عمل ہے جس کو مسجد ہی میں انجام دینا واجب ہے، لیکن مسجد کا کردار ان دو اعمال تک محدود نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسجدیں درسگاہ بھی تھیں، یہیں تذکیہ واحسان کی بزم بھی آراستہ کی جاتی تھیں، اسی میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات فیصل کئے جاتے تھے، یہیں سے فتاویٰ صادر کئے جاتے تھے اور مسائل شرعیہ کی رہنمائی ہوتی تھی، یہیں مجاہدین اسلام کے لشکر مرتب کئے جاتے تھے، یہیں سے احکام سلطنت جاری کئے جاتے تھے، اور اسی جگہ بیرونی سفراء اور وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، غرض کے مسجد مسلمانوں کا ہمہ جہت مرکز تھی، اور مسجد کا امام زندگی کے تمام مسائل میں مسلمانوں کا قائد اور رہنما ہوتا تھا۔

افسوس کہ جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اضمحلال آ گیا اور مسلمانوں کا عمل قرن اول سے ہٹ گیا، اسی طرح لوگوں نے مسجد کو نماز واعتکاف تک محدود کر دیا، اور ائمہ صرف پانچ وقتہ نماز کے امام سمجھے جانے لگے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ باقی رہا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں امام کو اپنا قائد ورہنما سمجھیں اور نہ ائمہ میں اپنے درجہ ومرتبہ اور مقام کا احساس باقی رہا کہ وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرہ کی پوری زندگی کے امام ہیں، آج مسلمان جس

بے دینی، بے راہ روی اور معاملات اور سماجی زندگی میں شریعت سے غفلت کا شکار ہیں، اس کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسجد کو زندگی کے تمام مسائل میں مرکز ہدایت بنالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو بار بار کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب مولانا عبدالحفیظ ایلولوی صاحب نے اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، نیز قرآن وحدیث اور سلف صالحین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس میں مساجد اور ائمہ مساجد کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ائمہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں مساجد کے کردار کو بحال کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری فعالیت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیں، یہ ایک مفید کتاب ہے، مصنف نے مناسب سمجھا کہ تدریج پر عمل کرتے ہوئے اس کے تھوڑے تھوڑے حصے شائع کئے جائیں، اسی لیے ابھی اس کا پہلا حصہ جس میں مساجد کی اہمیت اور منصب امامت کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شائع کر رہے ہیں۔

یہ حقیر ابھی سفر میں ہے، اس نے مختلف مقامات سے مطالعہ کی سعادت حاصل کی، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب کتاب ہوں گی، موصوف نے نظام مساجد کی اصلاح کا ایک نظام بھی مرتب کیا ہے، اگر واقعی وہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خالد سیف اللہ رحمانی

نزیل : جامعۃ القرأت، کفلیۃ، گجرات

۷ شعبان ۱۴۳۸ھ

۳ مئی ۲۰۱۷ء

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی (ایم پی)
Mohammad Asrarul Haque
Member of Parliament
(Lok Sabha)

सत्यमेव जयते

16, South Avenue, New Delhi-110011
Ph.: 011-23795046 Telefax: 011-23795314
E-mail: mahaqqasmi@gmail.com

Ref. No. ....

Date 21/10/2017

تأثرات

(مفکر ملت حضرت مولانا محمد اسرار الحق صاحب قاسمی دامت برکاتہم)

شریعت اسلام میں ائمہ کی اہمیت و برتری اور فضیلت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ایک موقع پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''امام اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے''۔ اس کا ایک ظاہری مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران اماموں کی اقتدا کرنی چاہیے اور ان کے عمل کے مطابق عمل کیا جائے تاکہ ہماری نماز درست اور مکمل ہو سکے۔ لیکن ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ معاشرے میں امام کے منصب کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے اچھے اور اعلیٰ اخلاق و کردار کو اپنایا جائے اور اس سلسلے میں بھی انہیں اپنا راہنما بنایا جائے۔ نبی اکرم ﷺ پوری زندگی مسجد نبوی کے امام وخطیب رہے اور مسلمانوں کو دی جانے والی تمام تر تعلیمات مسجدوں کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھیں۔ چاہے معاشرتی مسائل ہوں یا اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلنے کی تدبیریں، چاہے تعلیم و تعلم ہو یا دیگر امور سب امام یعنی نبی پاک ﷺ کے ذریعے ہی لوگوں تک پہنچتے تھے۔ اسی طرح لوگوں کو نماز کے اوقات کی خبر دینا اور انہیں دن کے پانچ وقت کامیابی اور خیر کی طرف بلانا بھی نہایت ہی شرف اور فضیلت والا عمل ہے اور نبی پاک ﷺ نے امام کے ساتھ ساتھ مؤذنین کے لیے بھی بڑے اجر وثواب کی بشارت دی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول! مجھے کوئی کام بتائیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنی قوم کے امام بن جاؤ'' تو انھوں نے کہا ''اگر یہ ممکن نہ ہو تو؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر مؤذن بن جاؤ''۔ (شرح العمدہ) اس حدیث پاک سے سیدھے طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نگاہ میں امامت اور مؤذنی ایک اعلیٰ اور شرف والا عمل تھا اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ایک صحابی کو اس کی تلقین فرمائی۔ ایک دوسری حدیث جسے امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، اس میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''تین قسم کے لوگ قیامت کے دن مشک کے ڈھیر پر ہوں گے: ایک وہ جس نے اللہ کے اور اپنے غلاموں کے حقوق ادا کیے ہوں گے، دوسرا وہ شخص جس نے لوگوں کی امامت کی اور اس کے مقتدی اس سے خوش رہے اور تیسرا وہ شخص جس نے روزانہ پانچ وقت لوگوں کو نماز کی دعوت دی''۔ یعنی جو اذان دیا کرتا تھا، اس حدیثِ پاک سے تو اور بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور مؤذنی اللہ کے نزدیک موقر عمل ہے اور دونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کی خاص رحمت ومہربانی مقدر ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''محشر کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے لمبی ہوں گی''۔ یعنی وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نمایاں ہوں گے اور بآسانی پہچانے جاسکیں گے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا کہ ''محشر کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے لمبی ہوں گی''۔ یعنی وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نمایاں ہوں گے اور بآسانی پہچانے جاسکیں گے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا کہ ''اگر لوگوں کو پہلی صف میں نماز پڑھنے اور اذان دینے کی فضیلت کا علم ہو جائے تو قرعہ اندازی کی نوبت آجائے گی''۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے خاص طور پر امام اور مؤذن کے لیے رشد و مغفرت کی دعا فرمائی ہے۔ (سنن ابوداؤد)

ان فضائل کے ساتھ ساتھ امام و مؤذن کی اپنے مقتدیوں اور عام مسلمانوں کے تعلق سے مختلف ذمہ داریاں بھی ہیں جنہیں کما حقہ ادا کرنا ضروری ہے، تبھی وہ اس اجر وثواب کے حقدار ہو سکیں گے جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ محترم مولانا عبد الحفیظ ایلولوی نے ائمہ مساجد کی علمی، فکری، تربیتی موضوعات پر ائمہ کی رہنمائی کے لئے ایک قیمتی کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں بڑی جان فشانی کے ساتھ قرآن و حدیث اور اکابر امت کی تحریروں و افادات کی روشنی میں ائمہ کرام کی رہنمائی کے لئے نہایت قیمتی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ہر مسجد کے امام کے پاس ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے استفادہ کر کے اپنی مسجد میں مقتدیوں کی دینی وفکری رہنمائی میں اس سے مدد لے سکیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیتِ تامہ عامہ عطا فرمائے اور مرتب کے لئے دونوں جہاں کی سعادتوں کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

دعا گو
(حضرت مولانا) محمد اسرار الحق قاسمی
ممبر آف پارلیمنٹ وصدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن

تقریظ

جامع الشریعت والطریقت

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیہ

(شیخ الحدیث وسابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔

زیر نظر کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ ائمہ مساجد کی وساطت سے امت کی اصلاح کے لیے تالیف کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ کا موقع تو احقر کو نہیں مل سکا، لیکن کتاب کی ضخامت اور ابواب کی تقسیم پر سرسری نظر ڈالنے سے ترتیب وانداز قابلِ تعریف نظر آیا، کتاب کے اکثر مضامین حضرات اسلاف واکابر کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، مضامین کے مآخذ وحوالہ جات اندر موجود ہیں، اس لیے امید کی جاسکتی ہے یہ کتاب اصلاحی کام انجام دینے والے حضرات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی انشاءاللہ۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ: مؤلف نے اصلاحِ امت اور اصلاحِ معاشرہ کا جو بیڑا اٹھایا ہے، اور اس سلسلے میں ایک مستقل فکری تنظیم وجود میں لانے کا جو پروگرام طے کیا ہے ، اللہ تعالیٰ ان دونوں نیک مقاصد میں مؤلف کی بے حد مدد فرمائے، شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور اس لائن کی ساری رکاوٹیں دور فرمائے، اپنے خزانۂ غیب سے اسباب ووسائل مہیا فرمائے۔

اس پُرآشوب دور میں موصوف کی اس پیش کش پر اُنھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ ائمہ مساجد اور دیگر اصلاحی تنظیموں میں اس امید آور اصلاحی کام کو سراہا جائے گا اور عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

أملاہ : العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

تقریظ

حضرت اقدس مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم العالیہ

(صدر مفتی وشیخ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر)

محترمی ومکرمی مجی حضرت مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب دامت برکاتہم بعد سلام مسنون آپ کا گرامی نامہ اور آپ کی تصنیف ''نہج الائمۃ فی اصلاح الامۃ'' موصول ہوئی۔ فللہ الحمد والمنّہ، آپ نے جس بے پناہ محنت ومشقت سے یہ مواد جمع کیا اور ترتیب دیا ہے اس پر بہت ہی مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔

منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کے لیے تالیف کردہ مسودہ ''نہج الائمہ فی اصلاح الامہ'' ایک گراں قدر جدوجہد ہے۔ ایسے نایاب موضوع پر مؤلف کی نگاہ کا اٹھنا یہ بھی بفضل خدا ہے۔

اگر چہ اس موضوع پر ''تحفۃ الائمہ'' بھی ہے جو نہایت ہی عمدۃ کتاب ہے لیکن منصب امامت ونظام مساجد کو مذکورہ بالا طریقہ پر لانے میں اور معروفات ومنکرات کے درجات سے اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ میں یہ کتاب منفرد ہے۔ سو یہ کاوش نہایت ہی قابل تحسین ہے اور اس جانب اقدام قابل تعریف ہے۔

اپنے فرائض منصبی کی مصروفیات کی وجہ سے کتاب کو نہ دیکھ سکا تاہم جستہ جستہ مقامات پر نظر سے اندازہ ہوا کہ اصلاح امت اور اصلاح معاشرہ کے لیے امت سے حسن ظن رکھتے ہوئے اور خدائی مدد پر اعتماد کرتے ہوئے جو مضامین پیش کیے گیے ہیں نہایت ہی اہم ہیں جو ان شاءاللہ ضرور کارآمد ہوں گے۔

میں علماء حضرات سے اور بطور خاص ائمہ حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ اس کتاب کو اپنی اور اپنے ماتحت مقتدیوں کی اصلاح کے لیے ضرور پڑھیں، اور منصب امامت اور نظام مساجد کو خیر القرون کے نہج پر لانے کی کوشش ضرور کریں۔ ''مَا لَا یُدْرَكُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَكُ کُلُّہٗ'' کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

کتاب مذکور کی افادیت کے پیش نظر آپ نے ایک باعمل تنظیم کا بھی ارادہ کیا ہے، اس سے آپ کی فکری پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔'' اللہ کرے وہ وجود میں آکر ''سونے پر سہاگہ'' کا مصداق بنے، یہ بہت ہی عمدہ فکر ہے کیوں کہ اس میں کتاب ورجال کی دو قوتیں جمع ہوں گی۔ تاہم خاکسار اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ کی سرپرستی کی امید کو پوری نہیں کرسکتا، جس کا افسوس اور ندامت ہے۔ ہاں دعا ضرور کروں گا اور ارادہ رکھتا ہوں کہ دوسرے حضرات اس کو قبول کر کے تنظیم کو قوت بہم پہنچائیں۔ آمین

کتبہ العبد اسماعیل کچھولوی عفی عنہ

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

۱۷۔۳۔۱۶

تقریظ

جناب حضرت مولانا قاری عبدالستار صاحب اسلام پوری

(خادم القرآن والحدیث جامعہ امداد العلوم وڈالی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔

نماز کی امامت کو امامت صغریٰ کہتے ہیں ، جب کہ خلیفۃ المسلمین وحاکم وقت کی امامت کو امامت کبریٰ کہتے ہیں ۔نماز کی امامت کی عظمت واہمیت کا اندازہ اس سے ہو رہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ہی حضر وسفر میں امام رہے ۔ اگر آپ غزوہ کے لیے تشریف لے بھی جاتے تو مسجد نبوی میں امامت کے لیے کسی صحابی کو متعین فرماتے ، صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی نماز کی امامت کا منصب خلیفہ وحاکم کے علاوہ کسی کے حوالہ نہ ہوتا یہاں تک کہ موقعۂ جہاد پر لشکر کا امیر ہی ''امام'' ہوتا۔

غزوۂ ذات السلاسل کے موقع پر حضرت عمرو بن العاص ؓ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ سے فرمایا تھا نماز ''میں'' پڑھاؤں گا کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر مجھے بنایا ہے ۔صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت صدیق اکبر ؓ کو نماز کی امامت کے لیے منتخب فرمایا (جسے حضرات صحابہ کرام ؓ نے خلافت کی تعیین سمجھا) اس سے بھی منصبِ امامت کی اہمیت کا پتہ لگتا ہے۔

اور جب اس امامت صغریٰ کی نسبت صلوٰۃ سے ہے جو افضل الاعمال ہے تو شارع علیہ السلام نے اس فریضۂ نماز کی ادائیگی کے لیے اور نظم جماعت کی اہمیت کے لیے جس طرح

اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا اسی طرح اسے امام کے پیچھے باجماعت ادا کرنے کا بھی تاکیدی حکم فرمایا حتی کہ بلاعذر ترک جماعت پر وعید بیان فرمائی۔ اس کے لیے امام الانبیاء ﷺ نے ایک طرف محلوں میں بناء مساجد کی ترغیب دی تو دوسری طرف منصب امامت کا زیادہ حق دار کون ہے اسے بھی واضح فرمایا۔ اور امام کو اپنی ذمہ داری کا احساس رہے اس لیے فرمایا'' اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ '' اور ساتھ ہی ان ائمہ کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ نے دعا بھی فرمائی۔'' اَللّٰھُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّۃَ ''۔

خیر القرون میں ملک وملت کے جملہ امور مسجد ومحراب اور'' امامت '' سے جوڑے ہوئے تھے اور مسجد وامامت کا مفہوم بھی بہت وسیع تھا۔ اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ امامت کے مفہوم میں صرف نماز پڑھانا رہ گیا ہے، حتی کہ خود امام بھی اپنے آپ کو ایک ملازم کی طرح سمجھ کر منصب امامت پر فائز رہتا ہے !! جو اس منصب کے ساتھ حد درجہ ظلم وحق تلفی ہے۔ لہٰذا ائمہ مساجد کو چاہیے کہ اس منصب کی عظمت ومقام کو سمجھیں اور ایسی کتب کا مطالعہ کریں جن میں منصب امامت کی عظمت واہمیت پر اور مساجد وائمہ کے مقام اور ان کی ذمے داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے بل کہ بڑی شخصیات کی جانب سے ان پر جو تقریظات وتاثرات قلمبند کیے ہیں انہیں بھی بغور پڑھیں۔

تو لیجیے ! اس موضوع پر ایک مفصل کتاب '' نہج الائمہ فی اصلاح الامہ '' حاضر ہے۔ ضخامت کے پیش نظر مؤلف نے اس کے پانچ حصے کیے ہیں جن میں سے دو تو منظر عام پر آہی چکے ہیں اور اب یہ تیسرا حصہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں ائمہ کی صفات اور ان کی خوبیوں اور کمالات پر مؤثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

قابل صد مبارک باد ہیں !! اس کے مؤلف کہ انہوں نے فکر امت میں اپنی پیہم سعی

سے ائمہ کی پوری جماعت کو اس اہم گوشہ کی طرف متوجہ فرمایا، اور ان کی جانب سے اور دیگر علماء کی جانب سے اہم فریضہ ادا کیا۔ وہ ہمارے ہی ضلع ''صابرکانٹھا، گجرات'' کے موقر عالم جامعہ حسینیہ راندیر کے استاذ حدیث عزیزم مولانا عبدالحفیظ صاحب زید مجدہ ہیں۔

موصوف نے نظام مساجد اور منصب امامت کے مضامین کو جمع کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی ہے!! اس کا اندازہ مراجع ومصادر کی اس طویل فہرست سے ہوتا ہے جو حصہ اول کے ص ۱۱۸ پر موجود ہے۔ درسیات کی گراں قدر مصروفیات کے ساتھ اس قدر اہم موضوع پر قلم اٹھنا ملہم وھادی اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہی ہے کہ عالمِ اسباب میں ان مضامین کو سہل فرمایا۔

دوران تالیف بارہا فون سے نیز ملاقات پر اس کا مذاکرہ کرتے رہے اور رائے ومشورہ لیتے رہے۔ مولانا کی فکر وکاوش صرف مضامین کو جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کر دینا نہیں ہے، بل کہ دوبارہ نظام مساجد اور منصب امامت کو خیر القرون کے نہج پر لانا ہے!!! اور اسے بروئے کار لانے کے لیے باقاعدہ ایک تنظیم قائم کرنے کا ارادہ کر کے اس کے لیے ذی علم حضرات سے ملاقاتیں بھی کر رہے ہیں اور ان سے صلاح ومشورہ اور تائید حاصل کر رہے ہیں باسط وغنی ''اللہ تعالیٰ'' مؤلف کی اس کتاب کو شرف قبولیت عطا فرماوے اور نیک عزائم میں ان کی نصرت فرماوے اور اس کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے والوں اور شائع کرنے والوں کو اپنی نعمتوں سے خوب مالا مال فرماوے۔ آمین

احقر : عبدالستار اسلام پوری

خادم القرآن والحدیث جامعہ امداد العلوم وڈالی

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

ائمہ حضرات کی صفات، ان سے وابستہ امور

آج پورا عالم جس کشمکش سے دوچار ہے اس کی واحد وجہ اللہ تعالیٰ کی وہ ناراضگی ہے جو مسلمانوں کی اپنے مذہب سے غفلت بل کہ اس سے بیزاری وانحراف کا نتیجہ ہے۔ ماضی میں بھی جب جب اسلام اور اہل اسلام کی ناکامی ہوئی اس کا سبب بھی یہی رہا۔لیکن یہ بھی یاد رہے کہ جب بھی اسلام کی ناکامی ہوئی وہ اسلام کی ناکامی نہیں تھی، وہ صورتِ اسلام کی ناکامی تھی، اسلام کبھی بھی ناکام نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ جب جب بھی مسلمانوں میں اسلام کی حقیقت ظاہر ہوئی ہے لوگوں کے تجربات ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں اور اسلام کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت نے بھی بڑی سے بڑی صورت پر فتح پائی ہے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اسلام کے ساتھ فتح وکامرانی کا لازوال تعلق ہے۔ اس راہ کی قربانیاں اور کوششیں اسلام کی وہ زکات ہیں جس کو'' صاحب نصاب '' مسلمان ہمیشہ خوشی سے ادا کرتے رہے۔ یہ زکات میدان جہاد سے تصنیف وتالیف کے حجروں، وعظ وخطاب کے منبروں اور انفرادی وشخصی کوششوں تک ہر میدان میں دی گئی'' (ہماری ملی ذمہ داریاں)۔لیکن آج جس زکات کی ادائیگی کی ضرورت ہے وہ مذہبی اور قرآنی اصطلاحات کو مسلمانوں میں حقیقت کے ساتھ پیدا کرنے کی اور قرآنی نقوش کو نفوس میں ڈھالنے کی ہے کہ یہی اسلام کی حفاظت اور اسلام کی حمایت ہے۔

مثلاً علم صحیح وعمل مستقیم۔۔۔ خشیت وتقویٰ۔۔۔ یقین وتوکل ۔۔۔اصلاح ومعرفت۔۔۔ صداقت وامانت ۔۔۔حق وعدل ۔۔۔عفو وایثار ۔۔۔صبر وشکر۔۔۔زہد وقناعت۔۔۔تواضع وانکساری۔۔۔عبدیت وطاعت۔۔۔تعلیم ودعوت۔۔۔اور فکر وغم وغیرہ۔

● اولاً بطور خاص ائمہ حضرات ان کی حقیقتوں کو اپنے اندر پیدا کریں۔

● ثانیاً (اپنا عملی نمونہ پیش کر کے) تمام مسلمانوں میں پیدا کریں۔

ہم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں مذکور الصدر صفات اور ان کے علاوہ دیگر چند ایسی صفات جمع کر کے حضرات ائمہ کی راہ نمائی کی کوشش کی ہے، جن میں سے بعض کا اطلاق قرآن وحدیث میں مطلقاً (لفظ) ائمہ پر کیا گیا ہے۔ تاہم ان کو ہم نے مجازاً ائمہ نماز کے لیے پیش کیا ہے۔

کیوں کہ بتقاضۂ شرع جب یہ صفات عام مسلمانوں میں ہونا ضروری ہے تو قوم کے امام وہادی میں ہونا تو بطریق اولیٰ ضروری ہوگا۔ دیکھیے ذیل میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی روایت۔ امید ہے کہ ائمہ حضرات اس کا "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا" کہہ کر خوشی سے استقبال کریں گے اور پوری طرح ان سے متصف ہونے کی بھرپور کوشش بھی کریں گے بل کہ دعا بھی، اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنائی امت کو بنانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں گے۔

حضرت سائب بن خلاد رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی قوم کا امام مقرر فرمایا، اس شخص کو کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبلہ کی طرف تھوکتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کو امامت سے معزول کر دیا اور فرمایا کہ اس نے اس طرح (خلاف شریعت) تھوکنے سے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچائی ہے (مشکوٰۃ ۱۷)۔ غور فرمائیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چھوٹے سے عمل کی وجہ سے اس کو لائق امامت نہیں سمجھا۔ تو بڑے اعمال اور بڑی صفات کا کیا حال ہوگا خود ہی سمجھ لیجئے۔ اس سے ہم ائمہ حضرات کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک امام کو کیسا ہونا چاہیے۔ مراجع کا بیان حصہ اول میں ہے۔

(۱) کسی قوم کا مقتداء وامام بننے کی دو صفات

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے " وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ" (سجدہ ۲۴) ۔اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو امام وپیشوا بنا دیا جو (اپنے پیغمبروں کے نائب ہوکر) ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے جب کہ وہ صبر کیے رہے اور ہماری آیتوں پر یقین رکھنے والے تھے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں علمائے بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت وپیشوائی کا درجہ عطا کرنے کے دو سبب (دو شرط) ذکر فرمائے ہیں۔اول صبر کرنا دوم آیات الٰہیہ پر یقین لانا۔

- پہلا سبب صبر ہے، جو تمام اعمال میں سب سے بڑا عملی کمال ہے۔
- دوسرا سبب آیات الٰہیہ پر یقین رکھنا ہے، جو تمام علوم میں سب سے بڑا علمی کمال ہے۔

گویا اس آیت میں دو کمالوں کا ذکر ہے ایک عملی کمال جو صبر ہے اور دوسرا علمی کمال جو یقین ہے۔خلاصہ یہ کہ امامت کے لائق اللہ تعالی کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں یعنی صبر وتحمل والے ہوں اور علم میں بھی کامل ہوں یعنی محکم یقین والے ہوں۔

خلاصۂ تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت شریفہ میں مؤمنین کو تسلی ہے کہ اگر تم لوگ بھی یقین حاصل کرنے کے ساتھ صبر کرتے رہوگے تو ہم تم کو بھی ائمۂ دین بنادیں گے (معارف القرآن ۷/۴۷)۔

حضرت مفتی صاحب نے مذکورہ بالا تفصیل پیش کی ہے جس پر یہ عنوان قائم کیا ہے "کس قوم کا مقتداء وامام بننے کے لیے دو شرطیں" ہم نے ان کو مجمل صفات میں بیان کیا ہے۔

مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ دو صفات صبر ویقین ان ۳۰ صفات کا خلاصہ اور مجموعہ ہے جو سورۃ برأت، مؤمنون واحزاب میں دس دس بیان ہوئی ہیں جو کامل مومن کی

صفات ہیں۔بل کہ جن کلمات کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی ''وَاِذِابْتَلٰی اِبْرَاھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمَاتٍ'' ان کلمات سے یہی ۳۰ صفات مراد ہیں،اوران ہی صفات کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بارگاہ الٰہی سے امامت وپیشوائی کا انعام ''قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' ملا [۱] (معارف القرآن ۲۵۸/۲)۔توجہ فرمائیں جو دو صفات ''صبر ویقین'' ان ۳۰ صفات کی جامع ہوں وہ کس قدر عظیم ہوں گی!!! گویا ان دوصفات کو حاصل کر لینا ۳۰ صفات کو حاصل کر لینا ہے۔!!

مفسّر ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ ''وَجَعَلْنَا مِنْہُمْ اَئِمَّۃً---کی تفسیر میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ صبر ویقین ہی کے ذریعہ کسی کو دین میں امامت کا درجہ مل سکتا ہے۔''بِالصبرِ وَالیَقِیْنِ تُنَالُ الامامۃُ فِی الدِیْنِ...(تفسیر ابن کثیر ۱۰۴۹)۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ باب امامت کی حدیث ''الامام ضامن الخ'' کے بارے میں فیصلہ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنوں میں سے افضل ترین اور دیندار کوامام بنائیں،اورافضل ترین وہ ہیں جواللہ تعالیٰ کا علم ویقین رکھتے ہوں اوراس کی خشیت سے ان کا سینہ معمور ہو۔''ومِنَ الحقِ الواجبِ علی المسلمینَ ان یُقدِّمُوا اَخیارَھم واھلَ الدینِ،والاَفضلُ مِنھم اھلُ العلمِ باللّٰہِ تعالیٰ الذینَ یَخافُونَ اللّٰہَ'' (کتاب الصلوٰۃ ومایلزمہا از اسلام کا نظام مساجد ۱۱۲)۔

---

[۱] اگرچہ یہاں امامت سے نمازوں کی امامت مرادنہیں ہے جیسا ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے بل کہ اس سے عام اور بڑی امامت وپیشوائی مراد ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ اور دیگر نبیوں کی امامت وپیشوائی---اور ائمہ اربعہؒ---اور امام ابومنصورؒ اور ابوالحسنؒ ماتریدی واشعری کی پیشوائی۔لیکن پھر بھی یہ صفات نمازوں میں امامت کرنے والے ائمہ میں بھی مطلوب ہیں۔سوچیے کیا ان دو صفات کی جامعیت وکمالیت کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔

حدیث شریف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے زیادہ ضعف یقین کے خطرے سے آگاہ فرمایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔''اِنَّ اَخۡوَفَ اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیۡ ضُعۡفُ الۡیَقِیۡنِ'' کہ مجھے سب سے زیادہ اپنی امت پر جس کا خوف ہے وہ ضعف یقین ہے[۱] اور دوسری حدیث میں ہے'' مَنِ التَّکٰی بِغَیۡرِ اللّٰہِ فَقَدۡ ھَلَكَ ''(مفتاح العارفین ۴۹، ۱۷) کہ جو غیر اللہ پر توکل کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔ مطلوبہ دوصفات کا اصل بیان یہاں ختم ہوا آگے عبرت کے لیے ان دوصفات پر مبنی واقعات کا ذکر ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بے پناہ صبر وتحمل

کسی بدنصیب نے غیض وغضب اور شدت بغض وعداوت میں آکر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو طمانچہ ماردیا، تو حضرت امام اعظمؒ نے حد درجہ تلطف وانکسار سے فرمایا:

(۱) بھائی میں بھی طمانچہ مارسکتا ہوں لیکن نہیں مارتا،

(۲) میں خلیفہ سے تمہاری شکایت کرسکتا ہوں لیکن نہیں کرتا،

(۳) سحر گاہی کے وقت تیرے ظلم کے خلاف خدا کے آگے فریاد کرسکتا ہوں نہیں کرتا،

(۴) اور قیامت کے روز تمہارے ساتھ خصومت اور مقدمہ کر کے انصاف طلب کرسکتا ہوں مگر یہ بھی نہیں کرتا۔

(۵) بل کہ اگر مجھے قیامت کے روز دستگاری حاصل ہوئی اور میری سفارش قبول ہوئی تو میں تیرے بغیر جنت میں قدم بھی نہ رکھوں گا (از حدائق الحنفیہ، امام اعظم کے حیرت انگیز واقعات ۱۲۹)۔

---

[۱] حدیث کے الفاظ یہی نقل کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اخوف کے بعد ما سہو کاتب سے رہ گیا ہو۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے صبر وتحمل، بردباری اور فکر آخرت کا عالم یہ تھا کہ ایک موقع پر کسی خارجی نے امام صاحب کو برا بھلا کہا، غلیظ گالیاں دیں اور مبتدع اور زندیق تک کہا تو حضرتؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا ”غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ ھُوَ یَعلَمُ مِنۡ خِلاَفِ مَا تَقُوۡلُ“۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں تو جو کچھ کہہ رہا ہے خدا تعالیٰ جانتے ہیں کہ وہ مجھ میں نہیں ہے۔ اس کے بعد امام اعظمؒ پر گریہ طاری ہوا اور فرمانے لگے، مجھے اللہ تعالیٰ کا عذاب رلاتا ہے۔ عذاب کے تصور سے گریہ بڑھ گیا اور روتے روتے غش کھا کر گر گئے جب افاقہ ہوا تو فرمانے لگے۔ بارالہا جس نے بھی مجھ پر ایسی بات کہی جو مجھ میں نہیں تھی اس کو معاف فرما (مناقب موفق ۲۴۹)۔ یہ تھی ہمارے اسلاف کی صفت۔

ہمیں اور مقتدیوں کو اپنے یقینوں اور صبر وتحمل کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہمارا یقین اور صبر وتحمل قرآن وحدیث کے تقاضوں سے کس قدر قریب ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) صدقہ دینا مال میں کمی نہیں کرتا،

(۲) جو شخص کسی کی خطا معاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے،

(۳) جو شخص محض خدا کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے (مشکوٰۃ ۱۶۷)۔

اس حدیث شریف میں گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین صفات پر تین ضمانتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

(۱) صدقہ سے مال گھٹتا نہیں۔ حالاں کہ لوگ عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ مال گھٹتا ہے۔

(۲) کسی مجرم کو معاف کرنے سے معاف کرنے والے کی عزت بڑھتی ہے۔ حالاں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عزت گھٹ جائے گی۔

(۳) عاجزی وتواضع سے اللہ تعالیٰ متواضع آدمی کو بلندی عطا کرتے ہیں۔ حالاں کہ بظاہر اس نے اپنے درجے کو نیچے گرایا ہے۔ظاہر ہے یہ امور وہی انجام دے سکتا ہے جس کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کا پختہ یقین ہو۔

☜ **تَنَبُّہ:** صدقہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے مال سے قرب الٰہی کے حصول کے لیے نکال کر کسی کو دے۔خواہ یہ صدقہ فرض ہو یا واجب یا نفل۔اس کو صدقہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ صدقہ، دینے والے کے صدقِ ایمان پر دلالت کرتا ہے اور جنت کی نعمتوں کی سچی رغبت پر دلالت کرتا ہے (مرقات ۱۹۹/۴ باب فضل الصدقۃ)۔

عبدالرزاق بن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے بڑھ کر کسی کو حلیم الطبع اور بردبار نہیں دیکھا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ امام صاحب مسجد خیف میں تشریف فرما تھے، تلامذہ اور معتقدین کا حلقہ قائم تھا اتفاق سے میں بھی اس محفل میں موجود تھا کہ بصرہ سے آئے ہوئے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحبؒ نے اس کا ان کو مفصل جواب دیا۔سائل نے کہا اس مسئلہ میں امام حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے اور ان کی یہ رائے ہے، امام صاحبؒ نے فرمایا اخطا الحسن امام حسن سے غلطی ہوئی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ کہنا تھا کہ اسی حلقہ سے ایک شخص کھڑا ہوا جس نے منہ کو ڈھانک رکھا تھا امام صاحب کو مخاطب ہو کر کہنے لگا ''یَاابۡنَ الزَّانِیَۃِ'' اے بدکار عورت کے بچے آپ یہ کہتے ہیں کہ حسن نے غلطی کی ہے؟ لوگوں نے اس کی یہ شنیع حرکت دیکھی تو مشتعل ہوئے بہت سوں کے خون کھولنے لگے اور بہت سوں نے آستینیں چڑھالیں (عقود الجمان فی مناقب النعمان ۲۸۷)۔ واقعہ طویل ہے امام صاحب نے نہ صرف اس کو معاف کیا بل کہ دعائیں بھی دیں۔ان واقعات سے امام صاحب رحمہ

اللہ تعالیٰ کے صبر وتحمل کا اندازہ ہوا کہ کس قدر اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر وتحمل عطا فرمایا تھا۔

اگر ائمہ حضرات اپنے منصب امامت وقیادت سے دنیا وآخرت میں بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے صبر سے کام لینا چاہیے۔ مقتدیوں کے دل خراش کاموں اور باتوں سے بھڑکنا نہیں چاہیے بل کہ ان پر اجر وثواب اور بلندی مرتبہ کی نیت سے صبر کرنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن حکیم رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بردباری امام کی بردباری اور نرمی سے زیادہ محبوب نہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی جہالت امام کی جہالت سے مبغوض نہیں "اَنَّہٗ لَاحِلْمَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ حِلْمِ اِمَامٍ وَرِفْقِہٖ وَلَاجَھْلَ اَبْغَضُ اِلَی اللّٰہِ مِنْ جَھْلِ اِمَامٍ وَخُرْقِہٖ" (کتاب الزہد للامام احمدؒ ۲؍۶۰۲)۔ کتابوں میں ہے کہ ہر عمل کا بدلہ محدود ہے لیکن صبر کا بدلہ غیر محدود ہے اور صبر سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے (تعلیق الصبیح ۱؍۷۳)۔

آپ پڑھے ہوئے اس صبر کو یوں اختیار کریں کہ مثلاً آپ کو کسی نے گالی دی یا کوئی جانی مالی آپ کو نقصان پہونچایا یا آپ کی عزت کرنے والوں کے درمیان آپ کی بے عزتی کی تو آپ قصداً صبر کریں اور کوئی بھی انتقامی کاروائی اختیار نہ کریں باوجودیکہ آپ انتقام لینے پر قادر ہوں۔ بل کہ آپ اسے دعا دیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔ یہ دعائیہ جملہ آخرت کا سرمایہ اور ذریعۂ ہدایت بن جائے گا اور جو اس نے آپ کی بے عزتی کی تھی یا گالی دی تھی نہ وہ بے عزتی باقی رہے گی نہ تو اس گالی کا آپ کو کوئی نقصان پہونچے گا۔

اور اگر آپ نے اس کو جواباً گالی دیدی یا اس کی بھی بے عزتی کی تو اس برائی کا گناہ جس طرح اس کو ہوگا اس طرح آپ کو بھی ہوگا۔ کیوں کہ شرعاً آپ کو صبر کا حکم تھا نہ کہ گالی دینے کا

لہٰذا اس حکم کے توڑنے کا گناہ آپ پر ہوگا۔ بل کہ اس کو دین سے دور کرنے کا جو گناہ ہوگا وہ مزید براں۔ کیا آپ نے ان دونوں طرز اور ان کے نتائج پر غور کیا؟ کیا غور کے بعد یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمیں بھی صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے تو اب ائمہ حضرات کو اپنی کسی کوتاہی پر متولی صاحب یا ممبران یا کوئی عالم صاحب یا کوئی مقتدی اصلاحی بات کہے تو بھڑکنا نہیں چاہیے بل کہ اسے اپنا اصلاحی سامان سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔

آدمی کو دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قدرت نہیں ہوتی مگر خود کو تو دوسرے کی بات مان لینے کی اور اگر نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے خاموشی اختیار کر لینے کی قدرت تو ہوتی ہے۔ آدمی خلاف طبع امور کو نظر انداز کر لینے کا فن سیکھ لے ایسا کہ اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اس کو اگر قبول نہ کیا جائے تو لڑ پڑے اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔

تواضع اور عبدیت ایسی چیز ہے جس کا کوئی توڑ اور جواب ہی نہیں۔ مثلاً آپ سے کسی کے جان و مال کا کوئی نقصان ہو جائے تو اب دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ خود اس پر برسنے لگیں اس سے لڑ پڑیں۔ دوسری یہ کہ آپ عاجزی کرنے لگیں ارے بھائی مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما دیجیے۔ اس نرمی کا کوئی توڑ ہی نہیں اس نرمی سے آدمی کو بڑی بڑی مصیبتوں سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے! شعر

قدرت کو ناپسند تھی سختی زبان میں	پیدا نہ کی اسی لیے ہڈی زبان میں

یعنی زبان میں اسی لیے ہڈی نہیں تاکہ آدمی نرم بات کہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آدمی تواضع اور بندگی سے لوگوں کے دل جیت لیتا ہے۔

تواضع کی حقیقت

حضرت حکیم الامت مجدد الملت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ اپنے کو لاشئ سمجھے، اپنے کو رفعت (عزت وبلندی) کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے۔

تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو خاکسار سمجھ کر برا بھلا کہے اور حقیر وذلیل کرے تو تم میں انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ تو واقعی ایسا ہے پھر تو کیوں برا مانتا ہے۔ محققین کا قول ہے کہ تم یہ سمجھ کر تواضع اختیار کرو کہ حق تعالیٰ کی عظمت کا حق یہی ہے کہ ان کے سامنے ہر شخص پستی اور تواضع کو اپنی صفت بنائے اور اپنے کو لاشئ محض سمجھے اس پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ (العلم والعلماء ۱۷۷)۔

صحابہ رضی اللہ عنہم والا یقین

آپ نے آیت شریفہ سے ثابت شدہ صبر کو ملاحظہ فرمایا اب یقین کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا، اس کی قدرتوں وآیتوں کا اور غیب وتقدیر کا یقین اور ان پر توکل واعتماد، ایمان کے بڑے ثمرات ونتائج میں سے ہیں اور مومن کی عظیم وعمدہ صفات میں سے ہیں۔ انسان اکیلا اپنے ہاتھوں حالات وحوادثات سے ٹکرا نہیں سکتا کیوں کہ وہ فطری طور پر نہایت کمزور ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے رب پر اعتماد وتوکل کر لے اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر لے تو پھر وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس پر بھروسہ کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد کا مستحق بن جاتا ہے۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب نمرودی خاکستر کرنے والی آگ میں ڈالا گیا اور فرشتے مدد کو پہنچے تو فرمایا اللہ مجھے کافی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کفار کے لشکروں سے جب ڈرایا گیا تو فرمایا اللہ ہمیں کافی ہے۔ "حَسْبُنَا اللّٰہُ" تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدد کی۔

موت و آخرت کا یقین

آیت مذکورہ میں آیتوں پر یقین کا ذکر ہے آیئے ہم صحابہؓ کے یقینوں کو روایتوں کی روشنی میں معلوم کرتے ہیں کہ ان کا ایمان ویقین کیسا تھا اور کتنا پختہ تھا تاکہ ہم بھی ان کے ایمان ویقین کی طرح اپنا یقین بنانے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ آدمی اتنے ہی دین پر چلتا ہے جتنا اس میں ایمان ویقین ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''تقویۃ ایمان'' کے تحت ایسی احادیث پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تقویت ایمان کی فکر فرمایا کرتے تھے۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابن عساکر رحمہ اللہ تعالیٰ کی طویل تخریج کردہ روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حارث بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ صبح کس حال میں کی؟ تو فرمایا '' عَزَفْتُ عَنِ الدُّنیاَ واظْمأْتُ نَہارِی واسْھَرْتُ لَیْلِیْ وکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی عَرْشِ رَبِّیْ، وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اھلِ الْجنّۃِ فِیْہَا یَتَزاوَرُوْنَ وَاِلٰی اَھْلِ النَّارِ یَتَعاوَوْن---'' (حیاۃ الصحابہ عربی ۳/۲۳)۔ اس حال میں کہ میں دنیا سے منقطع ہو چکا ہوں، دن بھر روزے سے رہتا ہوں، رات بھر عبادت کرتا ہوں، اور گویا اپنے رب کے عرش کو دیکھ رہا ہوں، اور گویا اہل جنت کو آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے (خوشی سے) مل رہے ہیں اور جہنمی لوگوں کو اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کو (مدد کے لیے) پکار رہے ہیں (یا ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑے ہیں)۔

---

[1] تقویت ایمان کے اسباب حصہ چہارم میں مذکور ہیں۔

اسی طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پوچھا اے معاذ تم نے کس حال میں صبح کی؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان (یقین) کی حالت میں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر بات کی ایک سچائی اور ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہاری بات کی سچائی یعنی اس کی دلیل کیا ہے؟ تو حضرت معاذؓ نے فرمایا یا نبی اللہ میں جب صبح کرتا ہوں تو مجھے شام کا یقین نہیں ہوتا (کہ میں شام تک زندہ رہوں گا) اور جب شام کرتا ہوں تو صبح کا یقین نہیں ہوتا اور جب کوئی قدم (چلنے کے لیے) اٹھاتا ہوں تو اس کے بعد دوسرے قدم کو اٹھانے کا یقین نہیں ہوتا۔ (حیاۃ الصحابہ عربی ۲۵/۳)۔

"کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا معاذُ؟ قال اَصبحتُ مومِنا باللہِ تعالیٰ قال اِنَ لکلِ قولٍ مِصداقا ولکلِ حقٍ حقیقۃٌ فما مصداقُ ماتقولُ؟ قال یانبیَ اللہ مااصبحتُ صباحاً قطُ الا ظننتُ انی لاأُمسِی، وما امسیتُ مساءًا قطُ الا ظننتُ اَنی لا اُصبحُ ولا خَطوتُ خَطوۃً الا ظننتُ انی لا اَتبعُھا اُخریٰ"۔

صداقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یقین

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت والا واقعہ مشہور ہے کہ ایک دیہاتی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑا خریدا لیکن ابھی قیمت دینا باقی تھی کہ اتنے میں دوسرا خریدار زیادہ قیمت سے خریدنے کے لیے تیار ہو گیا تو وہ دیہاتی معاملہ سے مکرنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں خرید چکا ہوں اب تو دوسرے کو بیچ نہیں سکتا لیکن وہ بیچنے والا دیہاتی انکار کر رہا ہے اور پھر اس نے کہا کہ اگر تم نے خریدا ہے تو اس پر کوئی گواہ پیش کیجئے کہ میں نے تم کو یہ گھوڑا بیچا ہے۔ تو حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے (جو اس گفتگو کے وقت حاضر تھے) اس کی گواہی دی معاملہ تو طے ہو گیا۔ لیکن معاملہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ سے پوچھا کہ (تم تو معاملہ کے وقت حاضر

نہیں تھے اور تم نے معاملہ کرتے مجھے دیکھا نہیں تھا پھر) تم نے گواہی کیسے دی؟

تو انہوں نے جواب میں فرمایا ''لِتصدِیقِكَ یا رسولَ اللهِ'' کہ آپ جب فرما رہے ہیں کہ میں نے خریدا ہے تو آپ کی سچائی کا مجھے پورا یقین ہے بالکل اسی طرح جس طرح آنکھوں سے دیکھنے سے۔ اس واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خزیمہ تنہا شخص کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ (حیاۃ الصحابہ ۶۲/۳)۔ کہ ہر کسی معاملہ میں صداقت کے لیے دو شخصوں کی شہادت معتبر ہے لیکن حضرت خزیمہ جب شہادت دیں تو ان کی تنہا ذات کی شہادت صداقت کے لیے کافی ہوگی۔، جیسا کہ فقہ اور اصول فقہ میں یہ واقعہ زیر بحث آتا ہے۔ غور کیجئے کہ حضرت خزیمہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کا کتنا پختہ یقین تھا کہ بغیر دیکھے معاملہ کی گواہی صرف آپ کی بات کا یقین کرتے ہوئے دی۔

نبی کی صداقت پر شہادت جب شجر وحجر نے دی ہے تو حضرت خزیمہؓ کی شہادت پر کیا تعجب۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خود نبی کو صداقت کا اہتمام اس قدر تھا، کہ اہل سیر نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ۴۰ سال پر قوم کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھے اور پہاڑ پر چڑھ کر فرمایا۔ ''لَبِثْتُ فِیکُمْ عُمُرًا، هَلْ وَجَدتُّمُونِی صَادِقًا اَمْ کَاذِبًا، قَالُوْا جَرَّبْنَاكَ غَیْرَ مَرَّةٍ، مَاوَجَدْنَاكَ اِلَّا صِدْقًا، فَقَالَ قُولُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تُفْلِحُوْا ''۔

رزق میں یقین

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل صدقات میں ایک طویل حدیث شریف ذکر کی ہے خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس چیز کی طلب میں لگ جائے جو اللہ تعالیٰ شانہ کے پاس ہے آسمان اس کا سایہ ہو زمین اس کا

بستر ہو۔ ایسا شخص بغیر کھیتی روٹی کھائے گا بغیر باغ لگائے پھل کھائے گا۔۔۔اللہ تعالیٰ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کو اس کی روزی کا ذمہ دار بنا دیتے ہیں۔۔۔(فضائل صدقات ۴۱۹)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) صحابہ رضی اللہ عنہم نے (یا اہل بیت رضی اللہ عنہم نے) ایک بکری ذبح کی (جب اس کا گوشت تقسیم ہو چکا تو) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں سے کیا باقی رہ گیا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے عرض کیا بجز شانہ کے کچھ باقی نہیں رہا (یعنی اس کا سب گوشت تقسیم کر دیا ہے۔ صرف شانہ باقی رہ گیا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بجز شانہ کے اور سب باقی ہے (مشکوۃ ۱۶۹)۔ اس میں قرآن شریف کی اس آیت شریفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ''مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ'' (نحل ۹۶)۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ جو خدا کے نام دیا وہی گوشت اللہ تعالیٰ کے ہاں باقی ہے اور اس کا ثواب باقی ہے اور جس کو تم لوگ باقی کہتے ہو جو کھانے کے لیے رکھا ہے وہ باقی نہیں کیوں کہ ثواب کے لیے اس میں سے کچھ نہیں بچا۔ دیکھیے کس قدر یقین کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں تو ہے کہ ہدیہ کا گوشت سائل سے بچا کر رکھا جب ضرورت کے وقت دیکھا تو وہ پتھر میں تبدیل ہو گیا ہے حالاں کہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بچا کر رکھا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے سائل کو نہ دیا اس لیے پتھر بن گیا۔ مطلب خدا کی ذات پر یقین کرتے ہوئے جس قدر ہو سکے یقینِ کامل سے خرچ کرنا چاہیے کہ وہ ضرورت کے وقت عطا فرمائیں گے۔

حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ صرف یقین کی تبدیلی پر ہی اللہ پاک اس زمین وآسمان سے کئی گنا زیادہ بڑی جنت عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے کو یاد رکھیے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں سے یقین نکل کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں

آئے گا ان ساری چیزوں کو اللہ پاک مسخر فرمائیں گے۔ورنہ اللہ تعالیٰ ان ہی چیزوں سے ڈرائیں گے جن کا یقین دلوں میں ہوگا "سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ أَشْرَكُوْا" (ال عمران ۱۵۱)۔اور حضرت جی فرماتے تھے کہ ایٹم سے ڈرنا ایسا ہے جیسا مشرکین کا اپنے پتھر کے بتوں سے ڈرنا۔ایمان ویقین کے ساتھ فرماتے تھے کہ ایٹم اور ایٹم والوں کی گردنیں قدرت کے ہاتھوں میں ہیں،ایٹم سے وہ ہوگا جو خدا چاہے گا۔فرعون بھی "وَهٰذِهِ الْاَنْهَارُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ" کہا کرتا تھا مگر خدا نے اسی پانی کو اس کے غرق وبربادی کا سامان بنادیا۔(تذکرہ حضرت جیؒ۔۵۰)

مرض سے شفا کا یقین

مظاہر حق میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ڈاڑھ میں درد ہوا تو بارگاہ حق میں فریاد کی تو حکم ہوا کہ فلاں گھاس استعمال کرلو۔چناں چہ استعمال کے بعد آرام ہوگیا۔کچھ مدت کے بعد پھر درد ہوا تو انہوں نے وہی گھاس استعمال کی تو بجائے درد کم ہونے کے اور بڑھ گیا۔تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور عرض کیا تو عتاب کے ساتھ جواب ملا کہ اُس وقت تم نے وہ گھاس ہمارے حکم سے استعمال کی تھی تو ہم نے شفا دی تھی اور اس بار تمہارا یقین گھاس پر تھا اور ہماری طرف توجہ نہ کی تو ہم نے شفا کے بجائے درد بڑھا دیا تا کہ تم کو یقین ہوجائے کہ شفا ہم دیتے ہیں۔(مظاہر حق ۳؍۱۴۰)۔

خلاصہ یہ کہ ہم ائمہ حضرات میں یہ دونوں صفات یعنی مصائب پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا کامل یقین اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہئیں اوران کے حصول کی طرف توجہ کرنی چاہیے اس کے بغیر وعدہ خداوندی کے ہم مستحق نہیں ہوسکتے۔اللہ تعالیٰ ہم کو صبر جمیل اور کامل یقین نصیب فرمائیں۔آمین

(۲) اقتدار کا معیار دو صفات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے سے کون ناواقف ہوگا ! انہوں نے خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد پہلے خطبے میں ارشادفرمایا: لوگو! میری خواہش یہ تھی کہ اس بوجھ کوکوئی دوسرا شخص اٹھاتا اوراگرتم مجھ سے اپنے پیغمبر کی اطاعت چاہو گےتو میں اس کا متحمل نہ ہوسکوں گا کیوں کہ وہ شیطان سے محفوظ ومامون تھےاوران پرآسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔

اقتدار پر فائز ہونا بڑی خطرناک ذمے داری ہے۔اس کی خواہش وطلب کرنے والا رب کی تائیدواعانت سے محروم ہوجاتا ہے اور سارا بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ہم اس شخص کوحاکم نہیں بناتے جواس کا طالب ہو(بخاری شریف)۔

آج سب جگہ لوگ اپنی عزت کی چھاپ کھڑی کرنے کے لیےاندھے بن کراقتدار کاڈنڈا حاصل کرنے کے درپے ہیں، ذرا بھی بصیرت نہیں کل روز قیامت کومعلوم ہوگا کہ اقتدار نے ان کی عبادتوں کا کیا حال کررکھا ہے۔ہاں اگرمطلوبہ اوصاف کے ساتھ ہوتو مضائقہ نہیں۔لوگوں پر اقتدار چاہے جس درجہ کا بھی ہو،ایک اہم منصب ومقام ہے،کیوں کہ اس سے اپنے ماتحتوں کی دینی ودنیوی خبرگیری مقصود ہوتی ہے۔ایسے شخص کواپنے مقام کے ناتے کن اہم اوصاف سے متصف ہونا چاہیے تاکہ اچھی طرح خبرگیری کرسکےتواس بارے میں قرآن کریم کی اہم ہدایت یہ ہے۔

مفسرقرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صاحب اقتدار میں دوچیزیں ''دوصفات'' پائی جانی ضروری ہیں۔

(۱) یہ کہ جس مقصد کے لیےکسی کومقتدا بنایا جائے وہ اس مقصد سے اوراس کے طریق سے پوری طرح واقف ہویعنی اسے اس کا مکمل علم ہو۔

(۲)چیز وہ اس راہ پر(اس علم کے مطابق) چل بھی رہا ہو(جس کواہتداء کہتے ہیں) یعنی اس کا عمل اس علم وواقفیت کےمطابق ہو۔

یعنی دو چیزیں ضروری ہوئی ایک علم دوسرا عمل۔ علم سے مراد علم صحیح اور عمل سے مراد عمل مستقیم ہے۔ غرض کہ کسی کو مقتداء بنانے کے لیے ''علم صحیح'' اور ''عمل مستقیم'' کے معیار سے جانچنا ضروری ہے۔

لہٰذا باپ دادا ہونا، یا لیڈر ہو جانا، یا صاحب مال و دولت ہونا وغیرہ قرآن کی نظر میں معیار اقتدار نہیں۔ حضرت نے قرآن شریف کی جس آیت شریفہ کی تفسیر کے تحت یہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے۔'' أَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ'' (مائدہ ۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں (تو بھی ایسا ہی کریں گے)۔ (معارف القرآن ۳/ ۲۵۰)۔

لہٰذا نہ تو نااہل کو مقتدا بنایا جا سکتا ہے نہ غلط اعمال کرنے والے کو، کیوں کہ جو شخص خود منزل مقصود کو نہ جانتا ہو، یا جاننے کے باوجود منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقل مند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا ہے بل کہ ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ گویا اس سے مروجہ طریقہ (باپ کے انتقال کے بعد بیٹے کو اور بیٹے کے انتقال کے بعد پوتے کو امام بنانے) کی قباحت ثابت ہوتی ہے جب کہ وہ اس معیار کے نہ ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک عنوان ''اقتدار کا معیار'' اور دوسرا ''نااہل کو مقتداء بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔'' قائم کر کے مذکورہ باتیں پیش کی ہیں۔ لہٰذا ائمہ اہلیت امامت کے حامل ہوں اور علم پر عمل کرنے والے بھی ہوں۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص بے علم ہو اور لوگوں کی امامت کرے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سمندر کے پانی کا وزن کرتا ہے۔ کیوں کہ اسے پانی کی کمی زیادتی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بس اسی طرح بے علم امام کو نماز میں ہونے والی کمی بیشی (صحت و فساد، کمال و نقصان) کا علم نہیں ہو سکتا۔ ''مَثَلُ الذی یَؤُمُّ الناسَ بِغیرِ علمٍ مثلُ

الذی یَکِیْلُ الماءَ فی البحرِ، لایَدرِی زِیادتَہ مِن نُقصانِہٖ"۔ (النصیحۃ الموجزۃ ۶۰)۔ خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص (امام) علماء کی خدمت میں آمد ورفت نہ رکھتا ہو اس کی اقتدا میں نماز نہ پڑھو "لاتُصَلُّوْا خلفَ رَجُلٍ لایَختلفُ الی العلماءِ"۔ (النصیحۃ ۵۹)۔ گویا آپ نے ایسے امام کو لائق امامت نہیں سمجھا کیوں کہ مسائل سے واقفیت نہ ہوگی۔ یہاں ان دوصفات کا اصل بیان ختم ہوا۔ اگر ذوق ہے تو آگے ملاحظہ فرمائیں۔

علم صحیح اور عمل مستقیم اور اہل السنۃ والجماعۃ

جس علم صحیح اور عمل مستقیم کا آیت بالا میں ذکر ہوا اس کی ضروری تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ چوں کہ استقامت عمل کا مدار علم صحیح پر ہے لہٰذا مناسب ہے کہ اس کو حدیث کی روشنی میں واضح کیا جائے۔

آیت شریفہ میں علم صحیح سے مراد عقیدہ کی صحت اور نظر وفکر کی صفائی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر وہ زمانہ بھی آئے گا جو بنی اسرائیل پر گذرا ٹھیک اسی طرح جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے کسی نے اپنی ماں (سوتیلی) سے بدفعلی کی تھی تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو اختیار کریں گے۔ اور بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے تو میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی۔ وہ تمام فرقے جہنم میں ہوں گے سوائے ایک کے (کہ وہ جنتی ہوگا)۔ صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون ہیں یعنی فرقہ ناجیہ کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ" وہ لوگ ہیں جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہیں۔ (مشکوٰۃ ۳۰ رواہ الترمذی)۔ دوسری روایت میں ہے ایک (فرقہ) جنتی ہے اور وہ جماعت ہے۔

پہلے حدیث شریف کی مختصر ضروری وضاحت ذہن نشین فرمائیں۔ پھر اہل السنۃ والجماعۃ کی تشریح۔

(۱) یہاں افتراق وفرقہ بندی سے بنیادی عقائد میں افتراق مراد ہے فروعات کا افتراق مراد نہیں۔ وجہ یہ کہ ان فرقوں پر دوزخی ہونے کا حکم لگایا گیا ہے جو عقائد کی خرابی کو بتاتا ہے، یہ حکم فروعی اختلاف پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ تو باعث رحمت وثواب ہے۔

(۲) میری امت کہنے میں امت اجابت مراد ہے نہ کہ امت دعوت۔ کیوں کہ امت دعوت کا بوجہ عدم اسلام جہنمی ہونا طے ہے جب کہ یہاں اسلامی فرقوں کا جہنمی ہونا مراد ہے۔

یہی بات علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی ''يُدْخِلُهُمُ النَّارَ مِنَ الافعالِ الرَّدِّيَةِ (مِنَ الْعَقَائِدِ) اَوْ يُدْخِلُوْنَهَا بِذُنُوْبِهِمْ ثُمَّ يُخْرِجُ مِنْهَا مَنْ لَّمْ يُفْضِ بِهٖ بِدْعَتُهٗ اِلَى الْكُفْرِ بِرَحْمَتِهٖ''[1]۔ (طیبی ۱/۳۳۵)

(۳) ان فرقوں کی اجمالی اقسام تو ۷ یا ۸ ہیں جن سے یہ فرقے بنتے ہیں۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس حدیث شریف میں عملی انحطاط کا بھی اشارہ کیا ہے اور علمی انحطاط کا بھی۔

---

[1] اسلامی فرقوں کے جہنمی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ حضرت حکیم الامت مجدد الملت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق جواب میں فرمایا ''یہ لوگ ابد کے لیے ''جہنم میں'' نہ جائیں گے بل کہ بعد سزا سب کی نجات ہوگی یعنی جن کو ایمان وتصدیق حاصل ہے ان کو نجات ہوگی، گو بہتر (۷۲) فرقے میں سے ہو۔ اور ان بہتر (۷۲) کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ ان کو عقائد فاسدہ پر بھی عذاب ہوگا جس میں اہل السنۃ شریک نہیں اور اعمال پر سزا ہونے میں سب شریک ہیں۔ اور تصدیق کی قید اس لیے لگائی کہ اگر کسی مُبتدِع کو ایسا غلو ہو جائے کہ وہ حدِّ ایمان ہی سے خارج ہو جائے تو وہ اسلام ہی سے خارج ہے اس کی ابدیت ناریت میں کوئی اشکال نہیں'' (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۲/۶۱، ۶۲)۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ''حدیث میں جو آیا ہے، امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ایک جنت میں جائے گا۔ بہتر (۷۲) دوزخ میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بہتر فرقے مُخلَّد فی النار ہوں گے، اور فرقۂ ناجیہ کے لیے بھی لازم نہیں کہ وہ دوزخ سے بالکل بری ہو بل کہ مراد یہ ہے کہ بہتر فرقوں کو عقائد واعمال دونوں پر عذاب ہوگا اور فرقۂ ناجیہ کو اعمال پر۔ خلود نار دونوں کے لیے نہیں'' (ملفوظات حکیم الامت ادارہ اشرفیہ ملتان۔ ج ۲۴/۱۹۹)۔

● عملی انحطاط یہ ہوگا کہ ماں سے بدفعلی کی جائے گی۔

● علمی انحطاط کا حال یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل میں علمی انحطاط سے اگر ۷۲ فرقے ہوئے تھے تو میری امت میں ایک اور فرقہ کا اضافہ ہوجائے گا۔ ''وَزَادُوْا فِیْ ارْتِکَابِ الْبِدَعِ بِدَرْجَةٍ'' (طیبی ۱/۳۴۷)۔

اس حدیث شریف میں صحت علم اور صحت عقیدہ کے معیار و میزان کا بیان ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اس میزانِ کے بیان میں کوئی طویل تقریر نہیں کی بل کہ ''مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ'' کا مختصر جملہ پیش فرما کر تمام صحیح عقائد کی (چاہے وہ ذات خداوندی اور اس کی صفات سے متعلق ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، قبر و آخرت سے متعلق ہوں کہ کبائر وصغائر سے، مصادر شرعیہ سے متعلق ہوں کہ صحابہؓ سے) راہ نمائی فرما دی۔

امام الہند حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (علماء دیوبند۔ تعریب حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی دامت برکاتہم۔ میں) فرماتے ہیں کہ آپ نے امت کے ۷۳ فرقوں میں حق و باطل کی معرفت کے لیے دو امر کو معیار قرار دیا۔

۱۔ ''مَا'' ۲۔ ''اَنَا وَاَصۡحَابِیۡ''۔

(۱) ''مَا'' سے سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوۂ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ فرمایا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ قائم تھے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''سنت'' بھی اسی کا نام ہے جن دونوں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل فرمایا اور صحابہؓ نے اس کو اختیار فرمایا۔ تو کلمۂ ''مَا'' اس ''سنت'' کا عنوان ٹھہرا جو فرقۂ حقہ کے لقب کا ایک جز ہے۔

(۲) رہا کلمۂ ''اَنَا وَاَصۡحَابِیۡ'' تو بلاشبہ اس سے وہ قدسی شخصیات مراد ہیں جن میں سرفہرست

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت ہے پھر شخصیات صحابہؓ۔ پس ''اَنَا وَاَصْحَابِیْ'' کا مطلب وہ جماعت ہوئی جو فرقہ حقہ کے لقب کا جز ثانی ہے۔ جن دونوں کا مجموعہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہے۔

اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت ''وواحدٌ فِی الجنّۃِ وَھِیَ الجماعۃُ'' میں اسی پہلی روایت میں ذکر کردہ ''انا واصحابی'' کو ''الجماعۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب اسی کا یہاں صراحتاً جماعت سے بیان ہوا ہے [۱]۔ (علمائے دیوبند عربی ۱۵۴،۱۵۵)۔

---

[۱] کتاب میں اس مذکورہ بحث سے یہ ثابت ہوا کہ

(۱) ''اہل السنۃ والجماعۃ'' قدیم جماعت ہے، کوئی بعد میں پیدا ہونے والی نہیں۔ اور یہی اصل جماعت ہے۔

(۲) جماعت حقہ کے لیے یہ لقب صحابہؓ کے مابین بھی معروف تھا (علمائے دیوبند ۱۵۲)۔

''اہل السنۃ والجماعۃ'' (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس زمانہ میں ''انا واصحابی'' فرمایا گیا تھا اس سے ملحق زمانوں میں) اہل ''حق'' کا ایک ایسا رمز تھا جس کی تعبیر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ''انا واصحابی'' سے ہوئی تھی۔ جس کی بنا وضع قرنِ اول میں تام ہوچکی تھی، جو قرونِ لاحقہ کی طرف سے ایجاد کا کوئی احتمال نہیں رکھتا۔ (علمائے دیوبند عربی ۱۵۱)۔

اس جماعت ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا اس کے سوا کوئی دوسرا لقب اس زمانے میں نہیں تھا۔ ورنہ ظاہر ہوتا۔ جیسا کہ مابعد کے زمانوں میں ''اہل القرآن، اہل الحدیث، اہل الفقہ، اہل الکلام، اہل التصوف، الجماعۃ الدینیۃ، الجماعۃ الایمانیۃ'' جیسے القاب مشہور ہوئے۔ (۱۵۸)

ان روایات وواقعات اور ان بحثوں سے معلوم ہوا کہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' اصلی جماعت ہے۔ جو اسم ورسم ۔۔۔ شکل وصورت ۔۔۔ شریعت وطریقت ۔۔۔ فکر ووجدان ۔۔۔ علم وعمل ۔۔۔ ذوق ومذہب ۔۔۔ علم ومعرفت ۔۔۔ استحسان و استخلاص ۔۔۔ دین وسیاست ۔۔۔ روایت ودرایت ۔۔۔ ظاہر وباطن ۔۔۔ لون ورنگت ۔۔۔ عقل ودین اور جہاد نفس ودشمن کے اعتبار سے قدیم ہے۔ یہی جماعت اسلام کی مضبوط بنیاد ہے۔

اسلام اپنے اول دن سے اس جماعت کی شکل میں وجود میں آیا اور وہ جماعت پہلی صدی ہی سے وجود میں آئی، اسی میں اس کا لقب اور مذہبی نام ''اہل السنۃ والجماعۃ'' وضع ہوا جو اس کے قدیم اور اصل ہونے کی دلیل ہے۔ (علماء دیوبند عربی ۱۶۰)۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آج تک اس کے اصل متبعین انہی مذکورہ خصوصیات وصفات پر بعینہ کسی کمی بیشی بغیر پائے جاتے رہے ہیں۔

آج ہر جماعت اپنے حق میں حق پرست اور اہل السنۃ والجماعۃ ہونے کا اور دوسروں کے بارے میں باطل پرست ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تاہم اس کا فیصلہ آج تو نہیں کیا جا سکتا۔

صفحہ نمبر ۳۶ کا باقیہ حاشیہ ـــــــــــ

اور علامہ طیبیؒ متوفی ۷۴۳ھ شرح مشکوٰۃ میں مذکورہ روایت کے تحت فرماتے ہیں کہ ''ما انا علیہ واصحابی'' سے مراد وہ حضرات ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سنت پر قائم ہوں (طیبی ۱/۳۳۷)۔

اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ''اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الاَعْظَم '' (مشکوٰۃ ۳۰)۔ کے تحت ظاہری علامت بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ سواد اعظم یعنی بڑی (اور معتبر) جماعت (جن کی اتباع کا حکم ہے) وہ ہے جو عقائد واصول اور اقوال وافعال میں جس پر علماء وعام مسلمان ہوں۔ پس انہی کی اتباع کرو اس لیے کہ یہی حق ہے اس کے ماسوا باطل ہے۔ اور فروعات میں امام مالکؒ، شافعیؒ، ابو حنیفہؒ اور احمدؒ کے نقش قدم پر رہو۔ یہ فروعی اختلاف (جماعت حقہ میں ہونے سے) مضر نہیں۔ ''فَمَا عَلَيْهِ الاَكْثَرُ مِنْ عُلَمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنَ الاِعْتِقَادِ وَالْقَوْلِ وَالْفِعْلِ، فَاتَّبِعُوْهُمْ فِيْهِ فَاِنَّهُ هُوَالْحَقُّ وَمَا عَدَاهُ بَاطِلٌ هٰذَا فِي الاُصُوْلِ---وَاَمَّا الْفُرُوْعُ --- كَمَالِكٍ وَالشَّافِعِي وَاَبِي حَنِيْفَةَ وَاَحْمَدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ يَجُوْزُ الْعَمَلُ بِهٖ '' (طیبی، ۱/۳۳۹)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں خط کھینچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''ھذا سبیل اللہ'' کہ یہ اللہ کا راستہ ہے اور اس میں صراط مستقیم کا ذکر ہے (مشکوٰۃ ۳۰)۔

اس کے تحت فرماتے ہیں کہ اگر تو یوں پوچھے کہ تمہارے صراط مستقیم پر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کیوں کہ ہر فرقہ اس پر ہونے کا مدعی ہے۔ تو میں جواب دوں گا کہ صرف دعویٰ اور وہم وزعم کافی نہیں ہوتا۔ بل کہ اس کو اس کے ماہرین سے اور ان علماء حدیث سے نقل کی ضرورت ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امور، آپ کے احوال وافعال، آپ کی حرکات وسکنات میں صحیح احادیث جمع کی ہیں اور اسی طرح مہاجر وانصار صحابہؓ کے احوال کو جمع کیا ہے۔

مثلاً امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ، مسلم بن حجاج قُشیریؒ وغیرہما وہ مشہور ثقات حضرات جن کی کتابوں میں بیان کردہ احادیث کی صحت پر اہل دنیا متفق ہیں۔ (طیبی ۱/۳۳۲)۔

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ روایت الباب کے تحت لکھتے ہیں کہ فرقۂ ناجیہ کے ظاہر کا نام شریعت ہے جس کو عام لوگوں کے لیے مشروع کیا گیا ہے، اور اس کے باطن کا نام طریقت ہے جو خواص کا منہج ہے، اور اس کے خلاصہ کا نام حقیقت ہے جو اخص الخواص کی معراج ہے۔ پس اول تو بدنی اعمال کا وظیفہ ہے، ثانی قلبی علم ومعرفت کا حصہ ہے اور ثالث روحانی مشاہدہ ورویت کا نصیبہ ہے۔ (مرقات ۱/۲۴۸)۔

کیوں کہ حق تعالیٰ نے فیصلے اور انصاف کے لیے قیامت کے دن کو مقرر کیا ہے جس دن ہر جماعت اپنے اپنے دلائل پیش کرے گی اور حق و باطل کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔

حضرت مولانا الطاف حسین نقشبندیؒ فرماتے ہیں: کہ ''مَا اَنَا عَلَیۡہِ وَاَصۡحَابِیۡ'' کا مفہوم بدعتی اور گمراہ شخص ''اپنے فاسد عقائد کو'' اپنے زعم وخیال میں کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ہونے کا مدّعی ہے۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کتاب وسنت کے وہی معانی ومفاہیم معتبر ہوں گے جو کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ومستفاد ہوں جنہیں صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا۔ جو شخص صحابہ کرامؓ کے مفہوم کے خلاف کتاب وسنت کا مفہوم بیان کرے بس یہی اس کے گمراہ ہونے کی دلیل ہے۔

جس طرح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو طریقۂ خداوندی سے جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسوۂ صحابہ کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا دین ہم تک ان ہی دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ ان دو واسطوں کو مانے بغیر دین باقی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا فرقۂ ناجیہ وہ ہوگا جو ان دو واسطوں کو مانتا ہو۔ (رہبر علم حدیث ۱۷۰)۔

یاد رکھیے چاروں مسلک کے حضرات جن میں اہل دیوبند بھی ہیں اہل السنۃ والجماعۃ ہیں۔ جن کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس مجتہد پر ہے۔ ان کا طریقہ ہر قسم کے افراط وتفریط سے منزہ ہو کر اعتدال وکمال پر مبنی ہے۔

اصول وکلیات کے لحاظ سے ان کا مسلک ائمہ حدیث (بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ۔۔)۔۔۔ائمہ تفسیر (قاضی بیضاویؒ، صاحب جلالینؒ اور ابن کثیرؒ)۔۔۔اور ائمہ عقائد (رازیؒ، اشعریؒ، ماتریدیؒ، غزالیؒ، ابن عربیؒ)۔۔۔ائمہ فقہ (ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ، مالکؒ)۔۔۔ائمہ احسان تزکیہ (جنیدؒ، معروف کرخیؒ، بایزیدؒ، ابن تیمیہؒ اور چاروں سلسلے قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ)

۔۔۔اور ائمہ اصول (فخر الاسلامؒ، علامہ دبوسیؒ)۔۔۔اور مشہور فقہی مصنفین (صاحب قدوریؒ، وہدایہ رحمہم اللہ تعالیٰ)۔۔۔اور علماء ہندوستان کے جبال العلم شاہ ولی اللہؒ، عبدالحقؒ، عبدالعزیزؒ وغیرہم کے مسلک ومشرب کے مطابق ہے۔

ان حضرات کے فروعی اور جزوی اختلافات سے قطع نظر اصول وکلیات اور بنیادی عقائد پر نظر ڈالیں گے تو آپ ان کو ان سابقین کا ہم مشرب ہی پائیں گے۔اس طرح کی عمدہ تفصیل صاحب مظاہر حق نے بھی پیش کی ہے وہاں مراجعت فرمائیں۔(مظاہر حق ۱/۲۳۴)۔

ہندوستان کے ماضی قریب کے مشائخ اور مشاہیر علماء (رشید احمد، قاسم، محمود الحسن، حسین احمد، انور کشمیری، اشرف علی، قاری طیب، الیاس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم)۔اسی مسلک کے سپہ سالار اور قائد ہیں جن کی زندگیاں ڈنکے کی چوٹ (اسلاف کی مذکورہ نشاندہی کے مطابق) اہل السنۃ والجماعۃ ہونے کی اعلان کرتی ہیں، پھر بھی کوئی اس سے اپنی آنکھیں بند کرلے تو یہ اسکی کوتاہی ہوگی۔ع۱ شعر

ہوشیار کو ایک حرف نصیحت ہے کفایت	نادان کو کافی نہیں دفتر نہ رسالہ

(۳) عہدہ دیئے جانے سے پہلے قابل نظر اس کا کردار

آدمی کا کردار نہ صرف دینی عہدے کے لیے معیار سمجھا جاتا ہے بل کہ دنیوی مناصب کے لیے بھی۔لوگ اعلیٰ منصب کے لیے اسی کا انتخاب کرتے ہیں جس کے کردار اچھے ہوں۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق جن اہم کرداروں کی نشاندہی کی ہے وہ ہے عدل وحق پرستی اور

ع۱ ہم نے صحت عقیدہ کے تحت یہاں ''اہل دیوبند کے موقف کی'' بات اس لیے کی ہے کہ ہم حق کی وضاحت میں مجبور ہیں۔کیوں کہ بوجہ ضرورت اظہار حق فرض ہے بل کہ اس کی دعوت بھی فرض ہے۔

خواہشات کی اتباع سے پرہیز کرنا، چناں چہ قرآن کریم نے بطور خاص عدالت اور بطور عام کسی بھی منصب وعہدہ دیئے جانے والے میں ان دونوں کولازم قرار دیا ہے۔

اس بارے میں قرآن کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ارشاد ہے ''یٰدَاوٗدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ'' (ص۲۶)۔اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرنا (کیوں کہ) وہ خدا کی راہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔اس میں صاف طور پر عدل وانصاف اور حق پرستی اور حق کی اتباع کا حکم ہے۔ظاہر ہے حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے نبی وپیمبر ہیں ان سے زیادہ امانت دار کون ہوسکتا ہے پھر بھی انہیں اس سے متنبہ کیا جارہا ہے، معلوم ہوا کہ اس سے دوسروں کو اس کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

نیز یہ ہدایت ویسے تو عدالت سے متعلق ہے کہ جو قاضی بنے اسے مقدمات و مخاصمات میں عدل کی رعایت کرتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔کسی رشتہ، پہچان اور کسی کے مقام ومرتبہ کو سامنے رکھ کر انصاف کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔کیوں کہ خواہشات کی پیروی راہ حق اور راہ ہدایت سے ہٹا دیتی ہے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر چہ حکم عدل تو عہدۂ عدالت وقضا سے متعلق ہے تاہم ضمنی طور پر ''ذمہ داری کا ہر چھوٹا بڑا عہدہ'' بھی اس میں شامل ہے۔ جس طرح حکم عدل بطور خاص تو حضرت داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مجازاً ہر عدالت کو شامل ہے۔(معارف القرآن ۷/۵۰۹)۔

لٰہذا ائمہ حضرات کو اپنے منصب امامت میں حق وعدل کا لحاظ ضرور کرنا چاہیے اور جس خواہشات نفسانی کو آیت میں ذریعۂ وضلالت وگمراہی بتایا ہے اس سے سخت اجتناب کرنا چاہیے۔عدل میں وہ تصفیہ بھی داخل ہے جو کوئی فیصل بن کر اختیار کرے،''وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ '' (نساء۵۸)۔جب تم لوگوں کے درمیان تصفیہ کرو تو انصاف کے ساتھ تصفیہ کیا کرو۔ چوں کہ ائمہ کو لوگ اپنے تنازعات میں فیصل بناتے ہیں اس لیے انہیں ان میں عدل سے کام لینا چاہیے۔

ائمہ حضرات کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آیے تو اس میں اہل ثروت وغیر ثروت، صاحب عزت وغیر صاحب عزت، چھوٹے بڑے، صاحب مرتبہ وغیر صاحب مرتبہ اور اپنے اور پرایے میں تفریق ہرگز نہ کریں اپنے مفاد کو دوسرے کے مفاد پر ترجیح نہ دیں۔بل کہ تعلیمات شرعیہ کے پیش نظر عدل کی رعایت کریں۔عدل کے تین درجات ہیں تینوں کی رعایت کریں۔

عدل کے تین درجات

● **پہلا عدل:** حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ عدل کا مفہوم مختلف نسبتوں سے مختلف ہوجاتا ہے۔مثلا انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے۔تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظ نفس پر اور اس کی رضا کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے محرمات سے اجتناب کرے۔

● **دوسرا عدل:** یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کرے وہ یہ ہے کہ

اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔

● **تیسرا عدل** : اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرے اور ادنی معاملہ میں بھی کسی سے خیانت نہ کرے اور کسی انسان کو اپنے کسی قول وفعل سے ظاہراً وباطناً کوئی تکلیف نہ پہنچے اس کا خیال کرے۔

نیز عدل میں عقیدہ کا اعتدال ،،،، عمل کا اعتدال ،،،، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔(معارف القرآن ۳۸۹/۵)

آیت شریفہ میں دوسری اہم چیز جس سے بچنے کا حکم ہے وہ ہے خواہشات کا اتباع۔ کیوں کہ وہ ضلالت وگمراہی کا ذریعہ ہے۔

(۱) وہ نہ صرف اہل حق کو دین پر قائم ہونے سے مانع ہوتی ہے۔

(۲) بل کہ کفار ومشرکین کو کفر وشرک سے نکل کر اسلام کی طرف آنے سے مانع بھی یہی چیز ہوتی ہے۔

یہ عملی طور پر بھی مانع ہوتی ہے اور علمی اور نظری طور پر بھی۔

اس خطیر گناہ کی طرف قرآن نے ان ہی دونوں طرح کے شکار طبقوں کی آنکھیں کھول دیں ہیں۔ عملی طور پر مانع ہونے کی مثال تو باسانی سمجھی جاسکتی ہے۔ نظری کی مثال ملاحظہ ہو، قرآن کا ارشاد ہے۔ ”أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ“ (فرقان ۴۳)۔ اے پیغمبر آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا خدا خواہشات نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ نظری خطا یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کو الٰہ اور معبود سمجھا جائے جیسا کہ آیت شریفہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں۔

بل کہ یہ (خواہشات کی اتباع) اتنی بڑی خرابی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی

اللہ عنہما تو اس کو بت پرستی کہتے تھے۔ کیوں کہ بت پرستی کا مطلب ہے غیر اللہ کی پرستش۔ چاہے پھر وہ بت کی ہو کہ خواہش کی۔ کیوں کہ بت پرستی میں اصل پرستش بت کی نہیں ہوتی بل کہ خواہش ہی!!! کی ہوتی ہے۔ (معارف القرآن ۴۷۶/۶) اللھم احفظنا من ذلک۔ یہ دو کردار عدل وحق پرستی اور خواہشات کی اتباع سے پرہیز وہ ہیں جو عہدہ دیے جانے والے میں دیکھنا ضروری ہے جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہی عنوان قائم کیا ہے ''عہدہ دیے جانے سے پہلے قابل نظر اس کے کردار'' (معارف القرآن ۵۰۹/۷) یہاں دو صفات کا اصل بیان ختم ہوا مزید اگر ملاحظہ کا ارادہ ہو تو ذیل میں کچھ تفصیل ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عدل کا اثر

آدمی کے حق پرست اور عدل پرست ہونے کا اثر نہ صرف اپنے ماتحت افراد اور انسانوں کی طبیعت پر پڑتا ہے بل کہ جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ علامہ دمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''حیاۃ الحیوان'' میں عدل کے اثر کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے عہد خلافت میں موسی ابن اعین کرمان میں بکریاں چرایا کرتے تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رات کے وقت ایک بھیڑیا آیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا، یہ واقعہ دیکھ کر ہم کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد صالح جن کی یہ برکت تھی شاید انتقال فرما گئے۔

چناں چہ ہم نے صبح اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب ان سے کسی نے دریافت کیا کہ تم کو اس کا کیسے علم ہوا کہ یہ ان کی برکت تھی؟ تو چرواہوں نے جواب دیا کہ جب وہ مرد صالح خلیفہ ہوئے تھے (جن کا عدل معروف ہے) تب

سے ہماری بکریاں، شیر اور بھیڑیوں کے خطرے سے محفوظ تھیں اور عالم یہ تھا کہ بکریاں شیر اور بھیڑیے ایک ساتھ چرا کرتے تھے۔ (دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات ۲۳۰)۔

آیت شریفہ میں فریقین کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے اور ان میں صلح واصلاح کرانے کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے **حضرت اقدس تھانوی** رحمہ اللہ تعالی کی بڑی عمدہ بات تحریر کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مخاصمہ میں فیصلہ کیا جائے اور اس میں صلح کرائی جائے تو حکم الٰہی کے موافق صلح کرائی جائے صاحب حق کو دبایا نہ جائے۔ ظاہر ہے صاحب حق کو دبانا (مجبور کرنا) حکم الٰہی کے خلاف ہے۔

پس صلح کرانے کا طریقہ یہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دبایا جاتا ہے۔ بل کہ صلح کرانے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو ناحق پر ہو اس کو تو دبایا جائے نہ کہ صاحب حق کو کیوں کہ اس کو دبانا اضرار (نقصان پہونچانا) ہے اور غیر صاحب حق کو دبانا اضرار نہیں۔ بل کہ اس میں تو خود اس کو اضرار سے روکنا ہے۔ مطلب یہ کہ صحیح بنیاد پر صلح کراؤ اور اگر اس پر راضی نہ ہو تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو (کمالات اشرفیہ ۱۸)

عدل اور شرعی احکام پر قادر شخص کے لیے طلب ولایت درست ہے

عنوان پر غور کریں، یہ بات قرآن کی روشنی میں کہی گئی ہے۔ اگر وقت کا حاکم یا اس کا ماتحت کوئی افسر لوگوں میں عدل قائم نہ رکھتا ہو یا شرعی احکام نافذ نہ کرتا ہو یا نہ کرسکتا ہو تو رعایا میں سے اگر کوئی شخص دنیوی غرض سے بچ کر عدل قائم کرنے اور احکام جاری کرنے پر قدرت رکھتا ہو تو قرآن شریف کی روشنی میں کہا جاسکتا کہ اس کے لیے اس عہدہ اور ولایت کو طلب کرنا درست ہے۔

جب سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانہ سے باعزت رہا کیے گئے تو بادشاہ کی نگاہ میں

انہوں نے ایک بلند مرتبہ حاصل کرلیا۔لیکن ملکی خزانوں کا حال دیکھا کہ وہ ضائع ہورہے ہیں اوراس کے حقیقی مستحقین محروم کئے جارہے ہیں اورخزانوں کی حفاظت نہیں کی جارہی ہے۔تو شاہ مصر سے خود یوسف علیہ السلام نے ولایت کوطلب کیا۔ ”قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ“ (سورۃ یوسف ۵۵)۔انہوں نے کہا کہ مجھ کوملک کےخزانوں پر مامور کردو میں ان کی حفاظت (بھی) رکھوں گااور میں (آمدوخرچ وغیرہ کےمواقع سے) خوب واقف ہوں۔

اس میں غور کیجئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جہاں ولایت کوطلب کیا ہے، وہاں انہوں نے طلب ولایت کی شرعی وجہ بھی بیان کی ہے کہ میں ان خزانوں کی پوری طرح حفاظت کرسکتا ہوں اورکروں گااورخرچ کے مواقع سےبھی پوری طرح واقف ہوں کہ کون مستحق ہےاورکون نہیں تاکہ مستحق پرخرچ ہواورخرچ کی مقدار بھی میں جانتا ہوں۔

اس سے مفسرینؒ نے لکھا ہے جو شخص عدل قائم کرنے اورشرعی احکام نافذ کرنے کی قدرت اپنے اندر پائےتواس کے لیے طلب ولایت جائز ہے،بل کہ بقول بعض،بعض حالات میں واجب ہے (معارف القرآن ۵/۸۸۔روح المعانی ۱۳/ ۹)۔

سوال یہ ہے کہ بہت سی روایات میں طلب ولایت کی مذمت وارد ہے پھر یوسف علیہ السلام کی یہ طلب کیسے درست ہوگی؟تومفسرین نے تمام روایتوں کوجمع کرنے کے بعد جواب دیا ہے کہ مذمت دنیوی غرض سے طلب کرنے میں ہے مثلاً: حب جاہ اور ولایت کا غیر شرعی استعمال۔اگرشرعی طریقہ پرہویعنی رضاءالٰہی اورشرعی احکام کےاجراء کے لیے ہوتو نہ صرف جائز ہےبل کہ مستحسن ہے۔

ائمہ حضرات اس مضمون پرتوجہ فرمائیں کہ ایک غیرعہدے دارکوشریعت نے اس لیے طلب ولایت کی اجازت دی ہے تاکہ وہ عدل وغیرہ احکام لوگوں میں جاری ونافذ کرے

۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عہدے دار اگر اس عہدے پر برقرار رہنا چاہے تو اسے عدل سے کام لینا ہوگا لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ آپس کے معاملات میں امیر وغریب، چھوٹے بڑے عزت دار غیر عزت دار میں امتیاز نہ برتیں بل کہ ان میں جو جو بھی شرعی احکام ہوں انہیں ان میں شرعی طور پر رائج کریں۔

معارف القرآن میں حضرت **مفتی محمد شفیع صاحب**ؒ نے لکھا ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بل کہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ انصاف کا مطالبہ صرف دوسروں سے ہی نہ ہو بل کہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہیے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا اظہار کرنا پڑے تو بھی حق وانصاف کے خلاف کچھ نہ بولے اگر چہ اس کا نقصان خود کی ذات پر پڑے ''وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ''۔

مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بعثت انبیاء اور تنزیل کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے اور آسمانی کتابوں کو اتارنے کا اصل مقصد عدل وانصاف قائم کرنا ہے ''لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' (سورۃ الحدید ۲۵)۔ (معارف القرآن ۲/۱/۵۷)۔

سورۃ نساء کی آیت ''وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ'' کے تحت روح المعانی میں لکھا ہے کہ دو بچوں نے کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور اس بات میں فیصلہ کے لیے کہ کس کی تحریر عمدہ ہے؟ انہوں نے حضرت حسن بن علیؓ کو حکم بنایا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے فرمایا اے بیٹے تم فیصلہ میں برابر غور کر لو اس لیے کہ یہ ایسا فیصلہ ہوگا جس کے بارے میں روز قیامت میں تم سے اللہ تعالیٰ سوال کریں گے۔ اور مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی موقع

پر حضرت علیؓ سے (اس طرح کے مسئلہ میں) فرمایا دونوں فریق میں نظر و نگاہ کرنے میں اور کلام وگفتگو کرنے میں برابری قائم رکھنا۔ یعنی دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا اور دونوں سے کلام بھی یکساں درجہ کا کرنا فرق نہ کرنا (روح المعانی ۵/۸۵)۔

(۴) کسی بھی عہدہ کے لیے دستور العمل

قرآن کریم نے ''منصب نبوت پر فائز'' انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جن اوصاف کا جا بجا ذکر کیا ہے ان میں امانت داری اور خیر خواہی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں اوصاف ان میں علی وجہ الکمال والاتم پائے جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ احکام خداوندی اور پیغامات الٰہی کے پہونچانے میں کامل طور پر امین و صادق اور ناصح ہوتے تھے ذرہ برابر خیانت نہیں کرتے تھے اور مخلوق خداوندی کے حق میں پورے طور پر وہ مشفق و خیر خواہ ہوتے تھے۔ لہٰذا دیگر عہدہ داروں میں بھی ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل آگے مذکور ہے۔

چناں چہ کتب عقائد میں بھی انبیاء علیہم السلام کی ان صفات کی اہمیت اور ان کی غرض کو بیان کیا گیا ہے تا کہ ان کے نائبین بھی ان اوصاف کے حامل ہوں۔ '' كُلُّهُمْ كَانُوْا مُخْبِرِيْنَ مُبَلِّغِيْنَ عَنِ اللهِ تَعَالٰى صَادِقِيْنَ نَاصِحِيْنَ لِلْخَلْقِ لِئَلَّا تَبْطُلُ فَائِدَةُ الْبَعْثَةِ وَالرِّسَالَةِ خُصُوْصًا فِيْمَا يَتَعَلَّقُ بِاَمْرِ الشَّرَائِعِ وَتَبْلِيْغِ الْاَحْكَامِ وَاِرْشَادِ الْاُمَّةِ (شرح عقائد ۱۰۲)۔

قرآن کا ارشاد ہے۔ '' أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ '' (اعراف ۶۸) ۔میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہونچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے خیر خواہ اور امانت دار ہوں ۔اس طرح کے مختلف الفاظ بہت سے نبیوں کے واقعات میں مذکور ہیں۔ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہے '' وَانتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنتُمْ قَائِلُونَ قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَد

بلَّغتَ وَ اَدَّيتَ وَنَصَحتَ " (مشکوٰۃ ۲۲۵) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ (قیامت کے روز) میرے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو دین پہونچادیا؟ تو تم کیا جواب دو گے تو صحابہؓ نے فرمایا آپ نے دین (پورا پورا) پہونچادیا اور جو امانت تھی (دین کی شکل میں) وہ ادا کردی اور (دین پہونچانے میں) خیر خواہی بھی کی۔ اب آیئے معلوم کرتے ہیں کہ کسی بھی عہدے کے لیے دستور العمل کیا ہو؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَالَت إِحدَاهُمَا يَاأَبَتِ استَأْجِرهُ إِنَّ خَيرَ مَنِ استَأْجَرتَ القَوِيُّ الأَمِينُ " (قصص ۲۶)۔ ان دونوں میں سے یعنی شعیب علیہ السلام کی دو بیٹیوں میں سے ایک بولی اے ابا جان اس کو یعنی موسیٰ علیہ السلام کو نوکر رکھ لیں بلاشبہ بہتر نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور ہو امانت دار ہو۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں شعیب علیہ السلام کو ان کی صاحب زادی جو مشورہ دے رہی ہے اس کی دلیل یہ بیان کر رہی ہے کہ بہترین اجیر وہ ہے جو قوی ہو اور امین بھی۔

قوی سے مراد اس کام کی قوت وطاقت والا ہونا ہے جو اس کے سپرد کیا جائے یعنی وہ اس کا ماہر ہو۔ اور امین سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی کے سابقہ حالات اس کی امانت داری اور دیانت داری پر شاہد ہوں۔ (معارف القرآن ۶/۱۰۷، ۶۳۰)۔

چوں کہ امامت بھی ذمے داری کا ایک اہم عہدہ اور اہم منصب ہے۔ اس لیے ائمہ کرام کو بھی آیت شریفہ کی تفسیر کے بموجب اپنی امامت میں ماہر و امانت دار ہونا چاہیے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ہر عہدے دار میں پایا جانا شرط ہے۔ جیسا کہ معارف القرآن میں حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ عنوان قائم کر کے (عہدہ سپرد کرنے کے لیے دو اہم شرطیں ہیں) ان کا ضروری

ہونا بتلایا ہے۔اور صفحہ ۱۰۷ پر عنوان قائم کیا ہے ''کسی کو کوئی عہدہ اور ملازمت سپرد کرنے کے لیے بہترین دستور العمل''۔

ان مذکورہ دو صفات (قوت وامانت) کا دعوی تخت بلقیس کے لانے والے عفریت جنّ نے بھی کیا تھا'' قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ''(نمل ۳۹) جب حامل تخت (یعنی منبر کے لانے والے) میں طاقت وامانت کی صفات ضروری ہیں تو صاحب منبر (ائمہ حضرات) میں تو ان دونوں کا ہونا بطریق اولیٰ ضروری ہوا۔

امامت میں قوت مہارت اور امانت وخیر خواہی

آیت مذکورہ میں قوی ہونے یعنی مہارت کا ذکر ہے کیوں کہ کسی بھی شعبہ کے کاموں کو بکمالہ انجام دینے اور باحسن وجوہ پایہ تکمیل کو پہنچانے کے لیے اس شعبہ کے جملہ امور سے واقفیت اور اس کی مہارت ضروری ہوتی ہے ۔جتنا کام ضروری ہوتا ہے اتنی اس کی مہارت ضروری ہوتی ہے۔جب کوئی کام مہارت سے کیا جاتا ہے تو وہ صحیح بھی ہوتا ہے اور مؤثر بھی اور مقدار میں زیادہ بھی۔

امام کے ماہر ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ جہری الصوت اچھے لہجہ والا اور مسائل سے واقف ہو۔ماہر کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے اور اپنے مقتدیوں کے احوال پر خوب توجہ حاصل ہو اور اس کی فکر حاصل ہو کیوں کہ بعض دفعہ توجہ نہ ہونے کی وجہ سے مسائل کے ماہر ائمہ سے بھی غلطیاں صادر ہوتی ہیں۔لہٰذا ماہر وہ ہے جو خود کی بھی فکر رکھے اور مقتدیوں کی بھی فکر رکھے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے اور مقتدیوں کی بھی گاہ گاہ اصلاح کرتا رہے بے فکر ماہر نہیں ہوتا۔

آج سے تقریبا ۴۰ سال پہلے جو ائمہ امامت کرتے ان کا حال یہ ہوتا کہ بستی کا امام مقتدیوں کے پورے دین وایمان، عقائد واعمال کی خبر رکھتا، وہ صرف نمازوں کا ہی امام نہ ہوتا بل کہ وہ اس کے ساتھ معلم ومبلغ بھی ہوتا اور قاضی وفیصل اور چودھری بھی۔ وہ آبادی کے دینی تمام کاموں میں پیشوا ہوتا آبادی پوری اس پر فدا ہوتی اس کی پوری طرح اطاعت کرتی، مقتدیوں کو بھی اپنے امام پر پورا اعتماد ہوتا، وہ اس کو اپنا حقیقی امام تسلیم کرتے۔ وہ زندگی کی پوری لگام امام کے ہاتھ میں دیدیتے حتی کہ اس کی ایک آواز پر قوم میں آنے والی برائی یا رسم رک جاتی یا نکل جاتی اور قوم یکسر اس برائی کو چھوڑ دیتی یہ ہے مہارت۔

امامت میں جس طرح مہارت ضروری ہے اسی طرح خیر خواہی اور امانت داری بھی ضروری ہے۔

قرآن شریف میں کئی جگہ اس مذکورہ خیر خواہی اور امانت داری کا ذکر مختلف نبیوں کی صفات بتاتے ہوئے کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر قریب میں گذر چکا ہے۔

خلاصہ جس کا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت وتبلیغ میں انتہائی ناصح بھی ہوتے ہیں اور امین بھی، اس میں ان کی کوئی ذاتی اور فاسد غرض نہیں ہوتی۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص الخاص صفت ہے۔

لہٰذا وارثین انبیاء علماء و ائمہ حضرات کو بھی اپنی تعلیم وتبلیغ میں اور پند ونصائح اور اصلاح وتربیت کرنے میں حقیقی معنی میں ناصح بھی ہونا چاہیے، اور حقیقی معنی میں امین بھی۔ کیوں کہ باطل بھی اچھائی ہی کے روپ میں آتا ہے، بل کہ ناصح وامین کے روپ میں بھی آتا ہے۔ ’’وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ‘‘۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لیے خیر

خواہی کا روپ اختیار کر کے نصیحت کی تھی ''اِنِّیۡ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیۡنَ'' بل کہ برادران یوسف نے اپنے والد کو فریب میں ڈالنے کے لئے اسی خیر خواہی کا سہارا لیا تھا ''اِنَّا لَہٗ لَنٰصِحُوۡنَ''۔ لیکن یہ خیر خواہی حقیقی نہیں تھی۔ آپ کو کیا بتاؤں موجودہ زمانے میں بھی لوگ اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لیے سہارا دشمنی کو نہیں بناتے کیوں کہ اس سے صحیح طور پر بدلہ نہیں لیا جا سکتا بل کہ (ظاہری) خیر خواہی کو سہارا بناتے ہیں۔

لہٰذا ائمہ حضرات یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ منصب امامت یہ اللہ و رسول کی جانب سے آپ کے پاس قوم کی امانت ہے لہٰذا قوم کی سچی خیر خواہی کے ساتھ صحیح صحیح راہ نمائی کرنا، درست طور پر امامت کرنا، مقتدیوں کی اذان، نماز، جماعت، قراءت قرآن اور وضوء وغیرہ میں ان کی کوتاہیوں سے حکمت سے باخبر کرنا اور ان کو آخرت کے خسارے سے بچانا یہ سب ہی اس امانت میں شامل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی راستوں سے اپنی ایک امت بنائی، ائمہ کو چاہیے کہ وہ ان راستوں سے امت بنائیں۔

امامت کبریٰ کے امام ''حاکم وقت'' کے لیے بھی حسب بیان کتب عقائد ان مذکورہ اوصاف کو ضروری قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر وہ مستحق امامت نہیں ہوتا۔ مثلا: اس کا امین و ناصح ہونا، لوگوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کرنے والا اور اسلام کی نشر و اشاعت کرنے والا ہونا وغیرہ۔

اور یہ بھی مذکور ہے کہ لوگوں پر ان اوصاف سے متصف امام کی ہی اتباع اور خیر خواہی لازم ہے ورنہ جو خائن و دھوکہ باز ہو اور خیر خواہ نہ ہو تو نہ اس کی اتباع ضروری نہ خیر خواہی۔

بس اس طرح امامت صغریٰ کے امام کے لیے بھی یہ اوصاف ضروری ہیں۔ کیوں کہ آخر یہ بھی اسی کی شاخ ہے، دونوں رشتۂ اخوت رکھتے ہے۔۔۔ ''وَالۡمُسۡلِمُوۡنَ لَابُدَّ لَھُمۡ مِنۡ اِمَامٍ ۔۔۔ کَانَ مُشۡفِقًا عَلَی الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۔۔۔ وَھُوَ یُرِیۡدُ اِعۡلَاءَ کَلِمَۃِ الۡاِسۡلَامِ ۔۔۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ

کَذٰلِكَ فَهُوَ لَيْسَ بِاِمَامٍ حَقٍّ فَلَا يَجِبُ اِعَانَتُهٗ وَلَا نَاصِحَ لَهُمْ "۔ (نبراس شرح شرح عقائد ۵۱۳)۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دین نصیحت ہے یعنی دین نصیحت وخیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا کس کی (نصیحت) ؟ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی اور اس کی کتاب کی اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے ائمہ (قائدین) کی اور عام مسلمان کی (مسلم شریف کتاب الایمان ۵۴)۔

مذکور حدیث گرامی کتنی اہم ہے اسے ملاحظہ فرمائیں۔ بقول بعض علماء یہ حدیث شریف چوتھائی دین پر اور بقول بعض کل دین پر مشتمل ہے۔ بل کہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتے ہیں "بَلِ الْمَدَارُ عَلٰی هٰذَا وَحْدَهٗ"۔

حدیث گرامی کی ضروری تشریح۔ یہ ہے کہ اس میں گویا سلطان الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے جملہ طبقات کو تحفظ دین اور اس کی ترقی کی بنیاد سے آگاہ کیا ہے۔ کہ تحفظ دین اور اس کی ترقی کی بِنا ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرنے اور ہر ایک کے ساتھ علی حسب المراتب حقوق ادا کرنے پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں اگر دوسروں کی خیر خواہی ہے تو آپ کا دین محفوظ ہے۔

لفظ نصیحت ہر قسم کی دینی و دنیوی خیر خواہی اور بھلائی کو شامل ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ ہر قسم کی خیر و بھلائی اختیار کریں، ادنیٰ بھلائی کو بھی معمولی نہ سمجھیں۔

رہی بات کہ مسلمانوں کے ائمہ سے کون مراد ہیں؟ تو علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ اس سے ائمہ دین مراد ہیں جو دو طرح کے اور دو قسم کے ہیں۔

ایک تو امام دنیوی (بادشاہ)۔ اور دوسرا امام دینی (امام صلوٰۃ) بتفصیل امامت کبریٰ وصغریٰ۔

علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ دنیوی امور کا سربراہ چاہے وہ ملک کا سربراہ ہو جیسے بادشاہ وزیر یا ضلع وتحصیل اور گاؤں کا۔ ہر ایک کی اطاعت اور خیر خواہی لازم ہے۔لیکن ان شرائط کے ساتھ جو عندالشرع ملحوظ ہیں۔تا کہ ملک وریاست اور شہر وقریہ دینی ودنیوی ترقی کرسکیں، ورنہ ترقی ممکن ہی نہیں۔ مذکورہ تفصیل سے جہاں یہ معلوم ہوگیا کہ دنیوی امام کی خیر خواہی واطاعت لازم ہے وہاں یہ بھی واضح ہوگیا کہ دینی امام کی بھی خیر خواہی واطاعت لازم ہے۔

دینی ائمہ کی نصیحت وخیر خواہی کا مطلب

علمائے اسلام (ائمہ مساجد بھی) انبیاءکرام علیہم السلام کے وارث ہیں اس وجہ سے وہ بھی احیاء دین اور احیاء سنت وشریعت کی محنت کرتے ہوئے لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور عقائد حقہ اور اوامر شرعیہ کی تبلیغ کرتے ہیں جو ان کا وظیفۂ حیات ہے تو ان کی خیر خواہی شرعاً لازم ہے۔ان کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کا کامل احترام کیا جائے ان کی تبلیغ کردہ دینی باتوں کو کما حقہ قبول کیا جائے اور اشاعت دین میں ان کا ہر لحاظ سے تعاون کر کے ان کا بازو ہوا جائے۔

اور عام مسلمانوں کی نصیحت وخیر خواہی یہ ہے کہ دنیا وآخرت کے مفید کاموں اور باتوں میں ان کی راہ نمائی کی جائے اور جزبہ ترحم وشفقت کے ساتھ انہیں دین وشریعت پر جمایا جائے اور ہر قسم کی مضرتوں سے انہیں بچایا جائے۔کیوں کہ یہی وراثت نبوی ہے۔

عالم ایک چوہے کے بارے میں امانت دار نہیں

صفت امانت کا ذکر اوپر گزرا اس صفت کے متعلق ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔اسے پڑھیے اور عبرت کا سامان حاصل کیجیے۔شیخ ابو یعقوب یوسف رازی رحمہ اللہ تعالی مشائخ صوفیہ میں سے ہیں، علم حدیث وتصوف دونوں کے جامع تھے۔تصوف

میں ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اور علم حدیث میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے تربیتِ یافتہ اور تلمیذ تھے۔

ان کا بیان ہے کہ مجھے پتہ چلا کہ ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو اسم اعظم معلوم ہے اسے حاصل کرنے میں ان کی خدمت میں پہونچا۔ میری ظاہری ہیئت کو دیکھ کر انہوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی، میں چند دن ان کی بےتوجہی کے باوجود ان کی خدمت میں رہا، اتفاق سے ایک دن ان کے یہاں علم کلام کا ایک ماہر عالم آپہنچا اور ان سے فلسفیانہ انداز میں عقلی بحث کرنے لگا، جس میں ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو ناکامی ہوئی وہ اس متکلم عالم کے سامنے معتبر دلائل پیش نہ کرسکے۔ یہ دیکھ کر میں نے اس عالم کو دعوت مناظرہ پیش کی چناں چہ میں نے اس کو مناظرہ میں لاجواب کردیا۔

اس واقعہ کے بعد ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ کو میرا علمی رتبہ معلوم ہوا تو اٹھ کر مجھ سے معانقہ کیا اور ابتک کی بےتوجہی پر معذرت کی بل کہ باوجود وہ بوڑھے اور میں جوان تھا میرے سامنے مؤدب ہوکر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ایک سال تک ان کی صحبت میں اکتساب فیض حاصل کرتا رہا، تو میں نے ان سے اسم اعظم معلوم کرنا چاہا لیکن وہ خاموش ہی رہے۔ البتہ مجھے ان کے طرز سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے بتائیں گے مگر اس کے بعد بھی ۶ ماہ تک ان کے پاس رہا لیکن اس کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

ایک دن گھر سے ایک طباق لائے جس پر رومال ڈالا ہوا تھا اور وہ بند تھا پھر مجھ سے پوچھا کہ فسطاط شہر میں ہمارے فلاں دوست ہیں کیا تم ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں جانتا ہوں۔ فرمایا یہ ہدیہ ان کو پہونچادو۔ میں اس طباق کو لے کر چلا اور راستہ بھر سوچتا رہا کہ اس میں کیا چیز ہوگی؟ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اسے کھولا تو ایک چوہا کود کر نکل بھاگا، یہ تماشا دیکھ کر مجھے ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ پر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا مذاق کیا! کہ

میرے ساتھ چوہا بھیجنا چاہا میں اسی حال میں واپس چلا آیا۔

ذوالنون رحمہ اللہ تعالیٰ میری صورت دیکھ کر ہی معاملہ سمجھ گئے اور فرمایا" یا احمقُ اِنَّما جَرَّبْنَاكَ۔" اے ناسمجھ ہم نے تم کو آزمانا چاہا کہ کیا ہم تمہیں ایک چوہے کے بارے میں امانت دار پاسکتے ہیں؟ لیکن تم نے تو اس میں خیانت کی پھر ہم تم کو اللہ تعالی کے اسم اعظم کے بارے میں کس طرح امانت دار سمجھیں؟ صاحب مقالہ قاضی اطہر مبارک پوریؒ فرماتے ہیں: کہ شیخ یوسف رازی حکمت وفلسفہ میں بازی مارنے کے باوجود ایک مرد کامل کی نظر میں اس قابل نہیں تھے کہ ایک چوہے کی امانت کو صحیح وسالم پہونچا سکیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بسا اوقات علم میں پختگی اور کمال کے باوجود اخلاقی وروحانی کس قدر خامی ہوتی ہے (ماہنامہ البلاغ بمبئی جلد ۲۶ شمارہ ۱۰، ۱۹۷۶ء)۔

اس پوری تفصیل سے ہم ائمہ حضرات کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مقتدیوں کو عقائد حقہ اور صراط مستقیم اور اعمال دینیہ کی راہ نمائی میں مکمل امانت داری سے کام لیں اس میں خیانت سے اپنے کو بچائیں۔ ورنہ روز قیامت میں سخت مواخذہ ہوگا اور نجات کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ اب تک جو بھی خیال رہا ہو لیکن اس تفصیل کے بعد عقل سلیم اور طلب صادق سے علم صحیح حاصل کر کے خود سے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر چل کر مقتدیوں کو بھی اس کی راہ نمائی کریں۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ چوں کہ رزق کے بارے میں حلال کو چھوڑ کر غیر حلال کو اختیار کرنا اور تقویٰ کو چھوڑ کر مشتبہ کو اختیار کرنا خیانت کی قسم سے ہے اسی مناسبت سے اگلے عنوان کو غور سے پڑھیں۔

علماء اگر مشتبہ مال کھائیں تو۔۔۔

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ الغافلین میں لکھا ہے کہ کسی نے کیا عمدہ

بات کہی ہے: اگر علماء حلال مال کھائیں تو عوام مشتبہ مال کھانے لگیں گے۔ اور اگر علماء مشتبہ مال کھائیں تو عوام حرام مال کھانے لگیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ علماء حرام مال کھانے لگیں تو عوام ایمان سے کفر کی طرف جانے لگیں گے۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھنے لگیں گے یہ حلال ہے تب ہی تو علماء اسے کھا رہے ہیں اور حرام کو حلال سمجھنا کفر کی بات ہے۔ اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بدنصیب علماء کے حرام مال کھانے سے ان سے بدظن ہوکر ایمان چھوڑ بیٹھے۔ (از روضۃ الصالحین ۳/۳۵)۔

حدیث شریف میں ہے "الحلالُ بیّنٌ وَالحرامُ بیّنٌ وَبَیْنَہُما مُشتَبِہاتٌ۔ (مشکوٰۃ ۲۴۱)۔ حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ (چیزیں) ہیں۔ یعنی کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا حلال ہونا سب کو معلوم ہے کہ یہ یہ چیزیں حلال ہیں اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا حرام ہونا بھی سب کو معلوم ہیں کیونکہ وہ سب نص قطعی سے ثابت ہیں۔ مثلاً شراب، زنا، سود وغیرہ۔

لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں جن کی حرمت وحلت کے دلائل معارض ہیں ایسی چیزوں کو مشتبہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ مجتہدین کے یہاں کوئی حکم واضح نہیں ہوتا بل کہ اس میں اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہو یا حلال۔ ایسی چیزوں کے بارے میں بقول راجح حکم یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نہ وہ حلال ہیں نہ حرام نہ مباح۔ اس کو اس طرح سمجھیں مثلاً کسی شخص کے پاس کچھ روپئے حلال کے ہیں لیکن اس کے پاس دوسرے کچھ روپئے حرام کے بھی ہیں اور وہ مخلوط ہیں تو ان مخلوط کو مشتبہ مال کہیں گے۔ لہٰذا ایسا شخص اگر ہدیہ دے یا دعوت دے تو بہتر یہ ہے کہ ان کے قبول کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

رزق کے متعلق بڑی دل چسپ بات شیخ علی متقی رحمہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ

حصول رزق کے متعلق احکام شرعیہ کی ترتیب اوراس کے درجات یہ ہیں۔

روزی حاصل کرنے کا اول درجہ لازم کا ہے۔۔۔دوسرا درجہ مباح کا۔۔۔تیسرا مکروہ کا۔۔۔چوتھا حرام کا۔۔۔اور پانچواں کفر کا۔

یعنی روزی کی اتنی مقدار حاصل کرنا جتنی ضرورت ہے لازم ضروری ہے اور ضرورت میں اپنی ذاتی ضرورت (کھانا پینا، کپڑے، مکان) اور بیوی بچوں کا نفقہ داخل ہے۔ضرورت سے زائد کمانا مباح ہے جب کہ نیت اپنی شان وشوکت اور اپنے وقار کی حفاظت ہو۔ضرورت سے زائد کمائے اور مال ودولت جمع کرنے سے نیت فخر وتکبر کا اظہار ہوتو یہ حرام ہے۔اگرچہ حلال ذرائع سے کمائے۔

خیر یہاں شیخ علی متقی کی بات یہ بتانا ہے کہ جب بندہ ضرورت پر اکتفا کرلیتا ہے تو اس کی عزت باقی رہتی ہے اور ہر خطرے سے سالم رہتا ہے۔مگر جب حد ضرورت سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حد مباح میں داخل ہوجاتا ہے اور حد مباح پر بھی قناعت نہیں کرتا اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو حد مکروہات میں داخل ہوجاتا ہے یہاں تک کہ حرص وہوس حد مکروہات سے نکال کر محرمات کی حد میں داخل کردیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اگلا قدم حد کفر میں پہنچ جاتا ہے!!۔نعوذ باللہ من ذلك (مظاہر حق ۳ر ۴۳۳، ۳۴)۔

اس کے برخلاف رزق حلال کی اہمیت پر کتابوں میں لکھا ہے کہ دعا کے دو پر ہیں جن سے وہ پرواز کر کے قبولیت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے ایک رزقِ حلال اور دوسرا صدقِ مقال۔۔۔

حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لیے اس بات کی دعا کردیں کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے ''مستجاب الدُعا'' بنادے،تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اپنی روزی کو پاکیزہ بنالو مستجاب الدعا بن جاؤ گے!!(فضائل صدقات ۳۹۳)۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب نور اللہ مرقدہ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کے زمانے میں ایک صاحب تھے۔ غالباً ان کا نام بابا عبداللہ شاہ تھا اور وہ گھسیارے تھے، گھاس کاٹا کرتے تھے اور گھاس کاٹ کر بازار میں بیچا کرتے تھے۔ اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ اتنی گھاس کاٹ لیا کرتے جس سے روزانہ ایک آنہ آمدنی ہوجایا کرے۔ اور انہوں نے پھر ایک آنہ کے حصے متعین کیے ہوئے تھے۔ ایک پیسہ اللہ کے راستے میں خرچ کردیتے تھے، ایک پیسہ جمع کر لیتے تھے اور دو پیسے اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کردیتے تھے۔ اور جو ایک پیسہ جمع کر لیتے تھے جمع کرنے کے بعد جب کچھ رقم جمع ہوجاتی تو بڑے علماء کو کھانے پہ بلا لیا کرتے تھے۔ سیدھا سادہ کھانا بل کہ سادہ چاول پکا کے ان کو کھلا دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کی دعوت کا انتظار لگا رہتا تھا کہ کب وہ ہماری دعوت کریں۔ اور فرماتے تھے کہ جب ہم ان کا کھانا کھا لیتے تھے تو چالیس دن تک ہمیں اپنی طبیعت میں اس کا اثر محسوس ہوتا تھا۔ اللہ جل شانہ کی عبادت کی طرف رغبت ہوتی تھی، نیکیوں کی طرف توجہ ہوتی تھی گناہ اور وساوس سے حفاظت رہتی تھی۔

اب بتائیے کہ گھاس بیچ کر پیسے کمائے گئے۔ اس سے علماء کی دعوت کی گئی مگر مقصد حلال رزق تھا، مقصد اللہ جل شانہٗ کی رضا تھی۔ اس لیے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نورہ اللہ مرقدہ کے بھی استاذ ہیں فرماتے ہیں، اس دعوت میں وہ نور تھا کہ چالس دن ہمارے اوپر انوار کی ایک عجیب کیفیت رہتی تھی (تحفۃ الائمہ ۱۹۱)

ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے خلیفہ تھے جنہیں آپ نے خلافت عطا کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اپنے بچے کے ساتھ حضرت کے پاس آئے۔ حضرت نے پوچھا ابھی آپ کاہے سے تشریف لائے؟ انہوں نے بتایا ریل سے، حضرت نے پوچھا اس بچہ کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا؟ انہوں نے جواب دیا آدھا، حضرت نے پوچھا اس کی عمر کیا ہے؟ کہا کہ بچہ تو ویسے تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لیے آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ سن کر حضرت کو سخت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی، اور فرمایا مجھ سے غلطی ہوگئی، تم اس لائق نہیں کہ تمہیں خلافت دی جائے اس لیے کہ تمہیں حلال وحرام کی فکر نہیں۔

حضرت مفتی صاحب اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ میں پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا۔ جب کہ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا تصور ہی نہیں کیوں کہ وہاں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات (نفلی) پورے کیے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں، اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص **حضرت تھانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ سے آکر کہتا کہ حضرت معمولات ترک ہوگئے ہیں تو حضرت فرماتے معمولات ترک ہوگئے ہیں تو استغفار کرو اور ہمت سے کام لو اور شروع کردو آئندہ ترک نہ ہوں۔ معمولات ترک ہونے سے کبھی خلافت واپس نہیں لی، لیکن حلال وحرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی۔

حضرت علامہ تھانویؒ فرماتے لوگ خانقاہوں میں ذکر وشغل سیکھنے کے لیے جاتے ہیں اگر ذکر وشغل سیکھنا ہے تو دوسری بہت ساری خانقاہیں کھلی ہوئیں ہیں وہاں چلا جائے ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱/۲۷۳)۔

(۵) خشیت الٰہی ائمہ (علماء) حضرات کا لازم وصف

آدمی جب کسی سے بالکل ناواقف ہوتو اس سے خوف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔مثلا آپ سانپ یا بجلی کا کھلا تار دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔کیوں کہ آپ سانپ اور بجلی کو جانتے ہیں ۔لیکن نا سمجھ بچہ اگر ان کو دیکھے گا تو وہ نہیں ڈرے گا، بل کہ بہت ممکن ہے کہ ان کو پکڑ لے کیوں کہ وہ ان کو نہیں جانتا۔

بس اسی طرح جو شخص (بذریعہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی،اس کی قدرتوں اور اس کی صفات) اللہ تعالیٰ سے واقف ہوگا وہ ضرور ڈرے گا۔حتیٰ کہ جو جتنا زیادہ واقف ہوگا اتنا زیادہ ڈرے گا۔یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی وعظمت کا علم ہو اور اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے ۔قرآن کریم نے یہی بات سمجھائی ہے۔ ”اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا“ (فاطر ۲۸)۔ معلوم ہوا خوف وخشیت علم پر مرتب ہیں بغیر علم کے خشیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اشکال وجواب

اگر یہ سوال ہو کہ بہت سے ان پڑھ اور جاہلوں میں خدا کا خوف ہوتا ہے، اس کے برخلاف بعض علماء میں نہیں ہوتا جو آیت شریفہ کے خلاف ہے؟(۱) جواب یہ ہے کہ آیت میں ”انما“ کے بارے میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ وہ حصر کے لیے ہوتا ہے۔تب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔

دوسرا یہ کہ وہ خصوصیت کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں اسی کے لیے ہے۔یہ قول ائمہ تفسیر ابن عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کا ہے۔

تب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا علماء کا وصف خاص ہے۔ تو ضروری نہیں کہ یہ وصف غیر عالم میں پایا ہی نہ جائے کیوں کہ خاصہ نہیں ہے نیز غیر سے نفی نہیں کی گئی ہے (معارف القرآن ۷/۳۴۷)۔ تو غیر علماء میں بھی خشیت پائی جاسکتی ہے۔

(۲) جواب یہ ہے کہ آیت شریفہ میں علماء سے مراد درس نظامی کی تکمیل کرنے والے علماء نہیں ہیں جس سے اعتراض قائم ہو۔ بل کہ مطلق علم سے متصف علماء مراد ہیں جو سبب خشیت ہو۔ کیوں کہ جب کبھی کسی کو خشیت حاصل ہوئی تو اس کی وجہ صرف علم ہی رہا ہے چاہے جس درجہ کا علم ہو۔ مثلاً: ایک عام آدمی جھوٹ بولنا اور امانت میں خیانت کرنا وغیرہ چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی سزا کا خیال آگیا اور وہ اس سے رک گیا تو اس کا اتنا علم اس کے لیے وجہ خشیت بن جائے گا۔ اس معنی کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ خشیت ہے اس کی وجہ اپنا علم ہے چاہے وہ جس درجہ کا بھی ہو۔ چاہے اب غیر علماء میں ہو اور چاہے عرفی عالم میں نہ ہو۔ کیوں کہ لاعلمی اور جہل ہی بے خوفی کا سبب ہے۔

چناں چہ مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ جل شانہ کی ذات وصفات کا کماحقہ علم رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا۔ اس کے بعد خشیت کے بارے میں بہت سے آثار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں "لَیْسَ الْعِلْمُ بِکَثْرَۃِ الْحَدِیْثِ وَلٰکِنِ الْعِلْمَ عَنْ کَثْرَۃِ الْخَشْیَۃِ"۔ **احمد بن صالح مصریؒ** فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی خشیت کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جاسکتا بل کہ اس کو کتاب وسنت کے اتباع سے پہچانا جاسکتا ہے۔ حضرت ربیعؒ فرماتے ہیں "مَنْ لَمْ یَخْشَ فَلَیْسَ بِعَالِمٍ" حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں۔ "اِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِیَ اللّٰہَ" حضرت سعیدؒ فرماتے

ہیں ’’اَتۡقَاھُمۡ لِرَبِّہٖ‘‘۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فقیہ کی تعریف یہ کی ہے: کہ فقیہ مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو گناہوں کی چھوٹ بھی نہ دے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو مطمئن بھی نہ کرے اور وہ قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے اور بے علم عبادت میں کوئی خیر نہیں اور بے فقہ علم میں بھی کوئی خیر نہیں۔

مفتی صاحبؒ ان کو نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ ختم ہو گیا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف نہیں۔ کیوں کہ ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم نہیں اور ان کے جاننے والوں کا نام عالم نہیں جب کہ ان میں خشیت نہ ہو۔ (معارف القرآن ۷/۳۳۸)۔

دارمی کی روایت ہے حضرت عطا رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا باری تعالیٰ تیرے بندوں میں سب سے اچھا اور درست فیصلہ کرنے والا آپ کے نزدیک کون ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ جو دوسروں کے حق میں ایسا ہی فیصلہ کرے جیسا اپنے حق میں۔

پھر پوچھا آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ غنی کون ہے؟ تو فرمایا وہ جو میری تقسیم پر سب سے زیادہ راضی رہنے والا ہو۔

پھر پوچھا سب سے زیادہ آپ سے ڈرنے والا کون ہے؟ تو فرمایا وہ شخص جو مجھے سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جیسے کہ روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا ’’اَنَا اَخۡشَاکُمۡ لِلّٰہِ وَاَتۡقَاکُمۡ‘‘۔ (روح المعانی ۲۲/۴۹۸)۔

مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری حالت یہ ہے کہ علم حاصل

کرتے ہیں پھر پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور اسی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں اور تحصیل خشیت کا اہتمام نہیں کرتے۔ ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں۔ علم کو میراث ابنیاء کہا گیا ہے اب دیکھ لو انبیاء کی میراث کون سا علم ہے۔ کیا انبیاء کا علم نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل واصطلاحات کا تلقط ہو اور خشیت کا نام نہ ہو ہرگز نہیں۔ وہاں تو حالت یہ تھی ''اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ''۔ اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عالم کہتے ہیں متبع سنت کو (اور مولوی کا بھی یہی مطلب ہے) کیوں کہ مولوی میں نسبت ہے مولیٰ کی طرف یعنی مولا والا، سو جب تک وہ اللہ والا ہے اس وقت تک مولوی بھی لائق اتباع ہے ورنہ قابل اتباع نہیں (العلم والعلماء ۳۸،۳۹)۔

جس خوف وخشیت کا ذکر ہوا اس کا تمام لوگوں سے بڑھ کر ائمہ کرام میں پایا جانا ضروری ہے۔ قوم کے امام اور قوم کے مقتداء ہونے کا تقاضی یہی ہے کہ ان میں خوف خداوندی دوسروں سے غالب ہو۔

☜ **تَنَبُّہ:** حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مذہب اسلام نے ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ کیوں کہ اعتدال کے دونوں طرف افراط وتفریط مضر ومہلک ہیں۔ لہٰذا خوف وخشیت میں بھی اعتدال کی رعایت ہونی چاہیے۔

حدیث شریف میں صلوٰۃ التسبیح کی دعا میں جو قبل السلام پڑھی جاتی ہے خوف کو بھی اللہ تعالیٰ سے حد اعتدال سے مانگا گیا ہے۔ وہ جملہ ہے ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مَخَافَۃً تَحْجُزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْكَ'' (مرقات ۳/۲۱۷) اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی نافرمانی سے روک دے۔ اسی طرح ایک اور دعا کے الفاظ ہیں ''اَللّٰھُمَّ اَقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْكَ۔۔۔ (مشکوٰۃ ۱۸۳)۔

مثلاً آدمی زنا کرنا یا چوری کرنا چاہتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا خوف ان سے رکنے کا سبب

بن گیا تو یہ خوف حد اعتدال میں ہے۔ لیکن اگر یہ خوف حد اعتدال سے بڑھ جائے تو یہ ہلاکت کا سبب بن جائے گا کیوں کہ خوف کی زیادتی بعض دفعہ ناامیدی پیدا کر دیتی ہے اور ناامیدی کفر ہے۔ حالاں کہ ایمان نام ہے خوف وامید دونوں کا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعتدالی خشیت کے زیور سے آراستہ فرمائیں۔ آمین۔

ائمہ، آں حضرت ﷺ کو دیئے گئے چند احکام بغور پڑھیں اور عمل میں لائیں

ابتداء اسلام میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے چند احکام کو اس غرض سے یہاں پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ائمہ حضرات نائب ہونے کے ناتے ان کو پڑھ کر اپنے اندر پیدا کریں اور ان صفات سے اپنے کو آراستہ کریں۔

ان صفات کی اہمیت ایک تو بایں وجہ واضح ہوتی ہے کہ یہ صفات براہ راست آپ ہی کو عطا ہوئی ہیں اور دوسری وہ ابتداء اسلام میں عطا ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان احکامات میں سے کچھ کا بیان متفرق طور پر قرآن شریف میں مستقلاً بھی ہوا ہے۔ لیکن شروع میں نازل ہونے والی دو سورتوں (مزمل و مدثر) میں یکجا طور پر بیان ہوئے ہیں تاکہ اختصاراً اذہن نشین کر کے عمل کرنا آسان ہو۔ اس لیے قرآنی اس طرز کی موافقت میں ہم انہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ہم حضرات علماء وائمہ کے لیے ان پر عمل کرنا سہل ہو۔

ان احکامات میں سے سورۃ مزمل کے احکام تو ذاتی اصلاح سے متعلق ہیں اور سورۂ مدثر کے زیادہ تر دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ خلق سے۔ چوں کہ علمائے کرام اور ائمہ مساجد انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں (بوجه وراثت تبعًا للنبی ﷺ) گویا وہ احکام انہیں بھی عطا کئے گئے ہیں، تاکہ وہ اپنے اندر ان سے کمال پیدا کریں۔

سورۃ المزمل کے احکام یہ ہیں۔

(۱) قُمِ الَّیْلَ۔ رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو۔ نماز تہجد مراد ہے۔

(۲) وَرَتِّلِ الْقُراٰنَ تَرْتِیْلًا۔ قرآن (شریف) کو خوب صاف صاف پڑھو۔

اصل ترتیل یہ ہے کہ حروف والفاظ کو اچھی طرح ادا کیا جائے، اور پڑھنے والا اس کے معانی پر غور بھی کرے اور اس کا اثر لے۔ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایک قاری قرآن پر سے ہوا جو ایک ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنا ہے؟ (یعنی ترتیل سے پڑھنے کا) پھر فرمایا یہی ترتیل ہے (جو یہ شخص کررہا ہے) (از قرطبی)۔

(۳) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ۔ پڑھے جا نام اپنے رب کا۔ یعنی اللہ کا ذکر کر۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ تصور ناممکن ہے کہ آپ ذکر اللہ سے غافل رہیں کہ آپ کو یہ حکم کیا جائے۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ آپ رات ودن ذکر اللہ پر مداومت رکھیں۔

(۴) وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا۔ اور سب سے تعلق قطع کر کے اسی (اللہ) کی طرف متوجہ رہو۔ قطع تعلق سے مراد یہ ہے کہ خالق کا تعلق مخلوقات کے تعلقات پر غالب رہے خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً۔

(۵) لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا۔ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ اور اپنے کام اسی کے سپرد کرو۔ یعنی توکل اور بھروسے کے قابل جس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا صرف وہی ذات ہے۔ جیسے قرآن شریف میں دوسری جگہ ہے وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سب مہمات ومشکلات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی کی دی ہوئی توانائی اور قوت اور ظاہری اسباب کو اپنے مقاصد کے لیے عمل میں لایے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے بے فکر ہوجائے۔ چناں چہ اسی مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے آیت بالا میں کارساز بنانے سے پہلے رَبُّ المشرِقِ والمغربِ فرمایا گیا ہے کہ جس کو تم نے وکیل بنایا ہے وہ مشرق ومغرب سب کا پروردگار ہے وہ سارے جہاں کی تمام ضروریات پوری کرنے کا کفیل ہے۔

(٦) وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور اچھے طریقے سے ان سے الگ ہو جاؤ۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہاں فرماتے ہیں کہ مقامات سلوک میں یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دشمنوں کی جفا پر صبر کیا جائے حتی کہ انتقام کا ارادہ بھی نہ کیا جائے۔ یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جس کو اصطلاح تصوف میں فناء کامل کہتے ہیں جس کے بغیر وہ مقام نصیب نہیں ہوتا۔ اور اچھے طریقے سے جدا ہونا یہ ہے کہ عامۃً جس سے تعلق منقطع کیا جاتا ہے زبان سے اس کی شکایت ہو ہی جاتی ہے تو اس کی قید لگا کر بتلا دیا کہ نہ کسی کے سامنے اس کی شکایت ہو نہ انتقام کا ارادہ۔

سورۃ المدثر کے احکام جو اصلاح خلق سے متعلق ہیں

(١) قُمْ فَاَنْذِرْ ۔ کھڑے ہوجایئے اور (لوگوں کو) ڈرایئے۔ انذار شفقت ومحبت سے ڈرانے کو کہتے ہیں جیسے باپ اپنے بچوں کو آگ اور سانپ سے ڈراتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہمت سے خلق خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالیے۔ (جو منصب نبوت کا مقتضی ہے)۔

تبلیغ وانذار میں سب سے پہلے توحید کی تبلیغ ہے اس کے بعد ضروری عقائد کی پھر ضروری اعمال واخلاق کی تعلیم۔ جن پر خود بھی عامل رہنا چاہیے کیوں کہ تبلیغ کے ساتھ اپنی اصلاح

بھی ضروری ہے۔

(۲) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ ''صرف'' اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔ (قول سے بھی عمل سے بھی)۔

(۳) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ اپنے لباس کو پاک رکھیے۔ لباس کو پاک رکھنے سے کپڑے، دل اور نفس سب ہی کو پاک رکھنا مراد ہوسکتا ہے۔ بل کہ اعضاء وجوارح کو بھی۔

یعنی دل کو عقیدہ کی اور اعضاء کو اخلاق کی گندگی سے پاک رکھنا۔ جیسے حدیث شریف میں ہے ''رُبَّ كَاسِيَةٌ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ'' (مشکوٰۃ ۱۰۹)۔ کہ دنیا میں بہت سی عورتیں کپڑا پہنے ہوئی آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

اس حدیث کے کئی مطالب ہیں۔ ایک مطلب تو واقعی کپڑوں سے برہنہ ہونا مراد ہے۔ جیسے ایک دوسری مشہور روایت ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ برہنہ اٹھائے جائیں گے۔ پھر پہلی روایت میں عورتوں کی تخصیص ان کو لباس کے باب میں تنبیہ کے لیے ہوگی۔ جب کہ اس حدیث (''الميّتُ يُبعثُ فِي ثيابِه التي يَموتُ فِيهَا'' (مشکوٰۃ ۱۴۴)۔ کہ میت کو روز قیامت میں اپنے کپڑوں سمیت اٹھایا جائے گا) سے اس پہلی حدیث کے خلاف مفہوم ثابت ہو رہا ہے۔

کیوں کہ لباس کے ساتھ حشر معلوم ہو رہا ہے تو علماء نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ یہاں ثوب (کپڑا) سے مراد اعمال ہیں۔ کیوں کہ محاورۂ عرب میں اعمال کو لباس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اعمال بھی بایں معنی لباس ہیں کہ وہ کپڑوں کی طرح انسان کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں چاہے اعمال نیک ہوں کہ بد۔ تو عورتوں کی تخصیص، اعمال پر تنبیہ کے لیے ہوگی۔ معلوم ہوا بہر صورت ہمیں اپنے عقائد واعمال اور اخلاق کو پاکیزہ بنانا چاہیے۔

(۴) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ بتوں سے الگ رہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں (رجز) سے ہر معصیت وگناہ کو مراد لیا گیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہ سے الگ رہو اور پاک

رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی سے بل کہ زمانۂ قبل نبوت سے ہی ان چیزوں سے دور ہیں پھر بھی یہ حکم کیا جارہا ہے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ آئندہ بھی ان سے دور رہو یعنی سابق توحید پر بدستور قائم رہو۔ کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ درحقیقت یہ حکم امت کی تعلیم کے لیے ہے اور خوب تاکید مقصود ہے کہ جب معصوم پیغمبر کو اس کا حکم اور خطاب کیا جارہا ہے تو امت کو اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۵) وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرْ۔ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے۔ یعنی کسی پر اس نیت سے احسان نہ کیجئے کہ جو کچھ اس کو دیا ہے دوسرے وقت میں اس سے زیادہ وصول ہوگا۔

(۶) وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ اپنے رب (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجئے۔ یہ آیت شریفہ تبلیغ سے متعلق ہے۔ جیسے اوپر قم فانذر تبلیغ سے متعلق تھی۔۔۔ اور کپڑے پاک رکھیے، بتوں سے الگ رہیے، احسان کے بعد زیادتی نہ چاہیں ان سب کا تعلق اپنی ذات سے ہے۔

مؤخر الذکر میں اول ''کپڑے'' سے اعمال۔۔۔ ثانی ''بتوں سے'' سے عقائد۔۔۔ اور ثالث ''احسان'' سے اخلاق مراد ہیں۔ گویا یہ چند آیتیں جامع ہیں اصلاح خلق اور عقائد واعمال اور اخلاق سب ہی کو۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی (معارف القرآن ۸/۶۱۰)۔

ان احکامات میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سمندر بکوزہ ہے ان میں سب ہی چیزیں آجاتی ہیں۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ عملی جامہ پہنایا جائے۔ اللہ تعالی ہم سب ہی کے لیے راہ عمل کو آسان فرمائیں اور ان کی توفیق نصیب فرمائیں۔

(۶) اول الواجبات معرفت الٰہیہ کا حصول ہے

''قَالَ عَلَيهِ الصلوٰةو السلام "اَلشَّرِيْعَةُ اَقْوَالِيْ وَالطَّرِيْقَةُ اَفْعَالِيْ وَالْحَقِيْقَةُ

آحْوَالِیْ وَالْمَعْرِفَۃُ اَسْرَارِیْ ''۔شریعت،طریقت،حقیقت اور معرفت یہ چار مرتبے ہیں۔ان میں طریقت حقیقت اور معرفت شریعت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ شریعت مانند دودھ کے اور طریقت مثل دہی کے اور حقیقت مثل مکھن کے اور معرفت مانند روغن (گھی) خالص کے ہے اگر دودھ ہی نہ ہو تو یہ تینوں کہاں سے بن سکیں؟

''قال علیه الصلوٰۃو السلام الشریعۃُ کَالسَّفِینۃِ۔۔۔ وَالطَّرِیْقَۃُ کالبحر ۔۔۔وَالحقیقۃُ کَالصَّدَفِ (سیپ)۔۔۔ والمعرفۃُ کَالدُّرِ، فمن ارادَ الدرَ یرکبُ السفِینۃَ ثم شَرَعَ فِی البحرِ یصلُ الدُرَّ ومن ترك ھٰذِہٖ الترتیبَ لم یَصِلِ اِلی الدر '' (ترجمہ مفتاح اللطائف ۴، ۳ حضرت خواجہ محمد اسلمؒ)۔آیئے ہم معرفت کی قدر سمجھتے ہیں!

معرفت الٰہیہ وہ بیش قیمت گوہر ہے جس کا حصول بقول امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ اول الواجبات ہے۔لہٰذا خشیت کی مذکورہ تفصیل کے بعد ہم ائمہ حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے منصب امامت کے ساتھ اپنے میں معرفت خداوندی کی فکر رکھا کریں اور جتنا ممکن ہو معرفت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات طے کرنے کی کوشش کریں۔

کیوں کہ معرفت خداوندی کے بھی مختلف درجات ہیں جن میں ادنی سے اعلیٰ کی طرف سیر مطلوب ہے۔یہاں درجات معرفت سے عمومی معرفت مراد ہے اہل تصوف کی معرفت کا ذکر اخیر میں مذکور ہے۔

معرفت کا پہلا درجہ

ان درجات میں سب سے مقدم اور ضروری درجہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔یعنی اپنے معبود حقیقی کو پہچاننا ہے۔امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن شریف کی آیت: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ

اَلَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھیے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے کے ذیل میں) لکھا ہے کہ بقول جمہور مفسرین یہ آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ پھر لکھا ہے کہ علماء متکلمین کا علی حسب اختلاف الاقوال اس پر اتفاق ہے کہ

* اول الواجبات: اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا،
* یا اس (کی معرفت) پر غور وفکر کرنا،
* یا کم از کم معرفت کے لیے غور وفکر کا قصد کرنا ہے [۱]،

اس کے ثبوت پر آیت اس طرح دال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین کی جانب مبعوث کرنا چاہا تو یوں نہیں فرمایا "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ لَاشَرِیْكَ لَهٗ" اس پروردگار کے نام سے پڑھیے جس کا کوئی شریک نہیں۔

---

[۱] جمہور اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جسے مذہب اسلام کی دعوت اور اس کی بونہ پہنچ سکی ہو۔ ورنہ مکلف (ایمان لانے والے) پر اول واجب توحید (لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ) کا اقرار ہے۔

چناں چہ امام اشعریؒ کے نزدیک اول واجب، اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور استاذ ابواسحاق اسفرائینیؒ کے نزدیک اول واجب، معرفت کے لیے غور وفکر کرنا ہے۔ اور قاضی ابوبکر باقلانیؒ، اور ابن فورکؒ اور امام الحرمینؒ کے یہاں غور وفکر کا قصد وارادہ اول واجب ہے۔

مذکورہ بالا حکم ظاہر یہ کے خلاف ہے۔ وہ ان چیزوں کو اول واجب نہیں مانتے کیوں کہ توحید فطری ہے تو عقل یعنی غور وفکر کا استعمال ضروری نہیں۔ لیکن جمہور توحید کے فطری ہونے کے باوجود اور غور وفکر کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعوت ثابت نہ ہونے کے باوجود استعمال عقل کو اول واجب مانتے ہیں۔

جمہور کے دلائل بڑی کتابوں میں ہیں اس کا اشارہ ملاحظہ ہو، قرآن کریم میں غور اور فکر وتدبر کا مکلف کیا گیا ہے۔ مثلاً "قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اس طرح کی آیات بے شمار ہیں اور حضرت عائشہؓ کی حدیث شریف میں ہے کہ اس شخص کے لیے ویل وخرابی ہے جو ان آیات "تفکر" کو پڑھے اور ان میں غور وفکر نہ کرے "وَیْلٌ لِمَنْ قَرَءَهَا وَلَمْ یَتَفَکَّرْ فِیْهَا" (رواہ ابن حبان فی صحیحہ) (نبراس ۲۴)۔

محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے حدیث " طَلَبُ الۡعِلۡمِ فَرِیۡضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسۡلِمٍ اَوۡ مسلمۃ" میں فریضۂ علم کی تشریح میں چند باتیں بیان فرمائی ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم مراد ہے۔گویا حدیث شریف سے بھی معرفت کا ضروری اور مقدم ہونا معلوم ہوا۔اسی طرح قرآن شریف کی اس آیت "وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنَ" میں بھی لِیَعۡبُدُوۡنَ سے معرفت مراد ہے۔

قرآن کریم نے اس الٰہ ومعبود کی معرفت میں خطا نہ ہو اس لیے چار صفات سے اس کی توضیح وتعیین کر دی۔چناں چہ

- پہلی صفت کو بیان فرمایا قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ معبود وہ ہوگا جو یکتا ہو۔
- دوسری صفت ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ وہ ساری کائنات سے بے نیاز ہو۔
- تیسری صفت ہے لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ نہ اس کی کوئی اولاد ہو نہ وہ کسی کی اولاد ہو۔
- چوتھی صفت ہے وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ اس کے مثل اور مشابہ کوئی بھی نہ ہو۔

پہلی تین صفتیں سمجھ میں آگئیں کہ وہ مخلوق کی صفت بن ہی نہیں سکتیں۔لیکن چوتھی صفت کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔کیوں کہ اس کے مثل اور مشابہ کچھ چیزیں پائی جاتی ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرح مخلوقات کا سننا دیکھنا، قدرت وعلم رکھنا اور دوسروں پر رحم وشفقت کرنا وغیرہ۔جواب یہ ہے کہ بندے اور خدا کی صفات صرف نام میں تو مشابہت ومماثلت رکھتی ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے مشابہ اور مثل نہیں۔

کیوں کہ مثلاً ہمارا علم حادث ہے، جائز الوجود ہے، عارضی ہے اور ہر وقت متجدد ہوتا رہتا ہے۔جب کہ باری تعالیٰ کا علم قدیم ہے، وجوبی ہے اور دائمی اور ابد تک کے لیے ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کی وہ صفات علی وجہ الاتم اور ذاتی ہوئیں جب کہ بندے کی یہ صفات ناقص اور خدا کی عطا

کردہ ہوئیں نہ کہ ان کی ذاتی (شرح عقائد ۵۰)۔خلاصہ یہ کہ جس میں یہ ذاتی صفات پائی جائیں وہی معبود حقیقی ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ

اللہ تعالیٰ کو معبود جان لینے اور تسلیم کر لینے کے بعد جو معرفت کا پہلا درجہ ہے اب دوسرا درجہ ہے۔جس میں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہم سے کس چیز کا مطالبہ فرماتے ہیں؟ اور یہ معلوم کرنا ہے کہ جو مطالبہ ہے اس کو کس طرح پورا کیا جائے؟

جس چیز کا مطالبہ ہے وہ تو ہے بندگی اور عبادت (مثلاً نماز، روزہ، حج، وزکوۃ وغیرہ) اور جس طرح کی بندگی کا مطالبہ ہے وہ اس طرح کی بندگی ہے جس کو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملی طور پر کر کے بتادیا۔مختصر یہ کہ اس کی رضاء وناراضگی کے امور (معروفات ومنکرات) کو جاننا اور پھر ان کو بجالانا ہے۔

(یعنی زندگی کے تمام مراحل وادوار میں حق وباطل، ہدایت وضلالت، نور وظلمت، طاعت ومعصیت، حلال وحرام، فناء وبقاء، صلاح وفساد، علم وجہل اور خلوص وریا کو جاننا اور ان کے فرق کو جاننا، جان کر قولاً، فعلاً، فکراً اوا عتقاداً فرق کرنا اور کمًا وکیفًا جیسا مطلوب ہے اس طرح بجالانا) اور سبقاً سبقاً ان میں ترقی اختیار کرنا یہ معرفت کا دوسرا درجہ ہے۔

حضرت سلطان باہو قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو فقیر فنا فی اللہ ہوتا ہے وہ اگرچہ ظاہر میں عوام الناس سے ہم کلام ہوتا ہے لیکن باطن میں اللہ تعالیٰ کی طرف حاضر رہتا ہے اور معرفت میں مشغول رہتا ہے۔پھر لکھا ہے کہ اب علم العلم کی شرح جاننا ضروری ہے اور وہ حق وباطل کی تمیز کرنا ہے پس دیکھنا چاہیے کہ حق کیا ہے اور باطل کس کو کہتے ہیں (ترجمہ کتاب تیغ برہنہ ۱۳، ۱۴)۔تو پہلا درجہ علم ہوا اور دوسرا علم العلم ہوا۔قرآنی اصطلاح میں اس کو حق کی معرفت کہتے ہیں قرآن شریف کا

ارشاد ہے ”وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَی الرسولِ تَرٰیٓ اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِ“ (مائدہ ۸۳)۔

ان دونوں قسموں کی معرفت کا نتیجہ یہ ہو کہ نمازیں اور دیگر عبادتیں برائے معرفت ہوں۔اور معرفت برائے طاعت وعبادت ہو۔یعنی ہر پچھلی معرفت سے اگلی معرفت،اور ہر پچھلی عبادت سے اگلی عبادت کمًا وکیفًا بڑھی ہوئی ہو جیسے مرقات میں ہے ”کُلَّمَا ازْدَادَ الْعَبْدُ مَعْرِفَۃً ازْدَادَ عُبُوْدِیَّۃً“ (۶۰ ج۱)۔(اللھم زد فزد) ذیل میں معرفت کے تیسرے درجہ کا بیان ہے لیکن پہلے معرفت کسبیہ کا حال۔

عند العلماء معرفت کسبیہ معتبر ومطلوب ہے

بطور خاص حضرات علماء وائمہ کے لیے تحصیل معرفت میں معرفت کسبیہ سے موسوم بحث کو بیان کرنا بھی معرفت میں اضافہ کا سبب بن سکتا ہے اس لیے اسے مختصرًا پیش کیا جاتا ہے۔

ایمان کہتے ہیں تصدیق کو،صرف علم ومعرفت(جاننے) کو ایمان نہیں کہتے۔اگر تصدیق ہے تو کہیں گے ایمان ہے۔صرف علم ومعرفت حاصل ہے تو کہیں گے ایمان نہیں ہے۔پھر تصدیق کہتے ہیں،نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دل کے قصد وارادہ کے ساتھ سچا جاننے اور قبول کرنے کو اور علم ومعرفت کہتے ہیں صرف اس طرح جانکاری اور معرفت رکھنے کو جو خود بخود حاصل ہو جائے (اس طرح کہ نہ تو مانے نہ تو قبول کرے)۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ تصدیق کے لیے قصد وارادہ ضروری ہے معرفت کے لیے قصد وارادہ ضروری نہیں وہ بغیر ارادہ بھی (صرف آنکھوں وغیرہ سے دیکھنے سننے سے بھی) بطور بدیہی حاصل ہو جاتی ہے۔مثلا:کسی شخص نے نبی کا کوئی معجزہ دیکھا تو اسے معجزہ دیکھنے سے نبی کے سچا ہونے کا بدیہی طور پر یعنی بلا قصد وارادہ یقین ضرور حاصل ہوگا،لیکن یہ ضروری نہیں کہ سچا

جاننے کے بعد نبی کو دل سے ماننے بھی جس کو تصدیق کہتے ہیں۔جیسے صالح علیہ السلام کی اونٹنی دیکھ کر ان کی قوم نے نبی ہونے کا یقین تو کیا لیکن تصدیق نہیں کی۔

اہل کتاب " اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاهُمُ الْكِتَابَ یَعْرِفُونَهٗ كَمَا یَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ "۔ (انعام/۲۰)۔وہ (اہل کتاب) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نبی ہونے کے ناتے) بالکل سچا نبی ہونا اسی طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (بیٹا ہونا)۔اس جاننے کے بعد بھی وہ ایمان لانے والے (تصدیق کرنے والے) نہیں کہلائیں کیوں کہ وہ جانتے تھے لیکن یہ جاننا غیر اختیاری تھا۔

ہاں اگر جاننا اپنے قصد وارادہ سے ہو (بطور بدیہی نہ ہو) جس کو معرفت کسبیہ کہتے ہیں تو پھر ایسی معرفت جو اپنی طرف سے حاصل کی ہو وہ تصدیق کہلائے گی۔

لیکن اس مذکورہ بات (معرفت غیر اختیاریہ کا تصدیق نہ ہونا) پر اعتراض ہوگا فرشتوں اور نبیوں کی تصدیق سے کہ ان کو بذریعہ وحی جو علم حاصل ہوتا ہے تو اس میں ان کے کسب واختیار کا تو کوئی دخل نہیں پھر اس پر تصدیق کا اطلاق کیسے درست ہے؟ تو اس کا جواب صاحب نبراس نے (صفحہ ۲۵۹) پر دیا ہے اور **حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب** نے شرح عقائد کی شرح میں یہ دیا ہے کہ یہ حضرات حصول اول کے بعد دوبارہ اپنے کسب واختیار سے تحصیل کے مکلف تھے تو پھر تصدیق کا اطلاق درست ہے (جواہر الفرائد ۵۶۳)۔

اس پوری بحث کو شرح عقائد وغیرہ کتابوں میں اس طرح بیان کیا ہے "وَالْمَذْكُوْرُ فِیْ كَلَامِ بَعْضِ الْمَشَائِخِ اَنَّ التَّصْدِیْقَ عِبَارَةٌ عَنْ رَبْطِ الْقَلْبِ عَلٰی مَا عُلِمَ مِنْ اِخْبَارِ الْمخبِرِ وَهُوَ اَمْرٌ كَسْبِیٌّ یَثْبتُ بِاختیارِ الْمُصَدِّقِ---وَلَا یَكْفِیْ فِیْ حُصُوْلِ التَّصْدِیْقِ اَلْمَعْرِفَةُ لِاَنَّهَا قَدْ تَكُوْنُ بِدُوْنِ ذٰلِكَ---وَلِذَا قَالُوْا مَنْ وَقَعَ فِیْ قَلْبِهٖ صِدْقُ النَّبِیِّ صلعم بِلَااِخْتِیَارٍ لَمْ یَكُنْ ذٰلِكَ اِیْمَانًا---نَعَمْ یَلْزَمُ اَنْ تَكُوْنَ الْمَعْرِفَةُ الْیَقِیْنِیَّةُ

اَلْمُکْتَسَبَۃُ بِالْاِخْتِیَارِ تَصْدِیْقًا"۔(۹۴)۔ لہٰذا ہمیں اور دیگر مسلمانوں کو بھی ایسی تصدیق پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمارا ذہنی داخلی اور خارجی وجود آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے تابع ہو جائے بل کہ ایسی معرفت یقینیہ کسبیہ میں اضافہ بھی ہو۔ یہ نہیں کہ وہ تصدیق صرف رسمی ہو اور وہ تصدیق و معرفت منجمد ہو۔

ایک عالم کی بات ملاحظہ فرمائیں، بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ہر شخص بطور خاص عالم اپنے علمی سفر کے دوران اپنے بچپن کے ایمان سے اوپر اٹھتا ہے لیکن میں زمانہ شعور سے قرآن وحدیث کی ہر ہر بات پر شعوری طور پر بالاختیار ایمان لاتا رہا اور تصدیق کرتا رہا جس کی وجہ سے ایمانی جمود کا شکار نہیں رہا بل کہ ہر وقت میں اپنے اندر تجدد ایمان پاتا رہا، پھر انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح شعوری ایمان و تصدیق کی دعوت دی ہے تا کہ ایمانی جمود ختم ہو۔

معرفت کا تیسرا درجہ

زندگی کے مختلف شعبوں میں رہ کر مخلوقات الٰہیہ پر غور وفکر کر کے اور ساتھ ہی اپنے ایمان ویقین میں خوب جدوجہد کرتے ہوئے اس کو ایسی مضبوطی بخشے جس کے نتیجہ میں تمام احکام شرعیہ مثلاً نماز، روزہ، حج وزکات، ذکر ودعاء، صدق وامانت، اخلاق وتواضع وغیرہ بجالانے میں اور منہیات شرعیہ مثلاً جھوٹ، کینہ، حسد، کبر، چوری، غیبت اور بدنظری وغیرہ سے بچنے میں پوری طرح معین و مددگار ہو جس کی وجہ سے دوسرے درجہ کی کمی بھی پوری ہو جائے بل کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ معرفت کا تیسرا درجہ کہلائے گا۔

مرقات میں لکھا ہے کہ معرفت بسا اوقات نفس کے خلاف مجاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نفس کو برے اخلاق اور اوصاف رذیلہ سے پاک کرنا، اور نفس کو اچھائیوں کے انوارات سے آراستہ کرنا۔ مثلاً توبہ، تقویٰ، زہد اور استقامت اور جملہ اخلاق حمیدہ، اور ایک حال سے دوسرے

حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اٹھنا اور بلند ہونا۔حتی کہ صفات جلالیہ کی کرنیں واضح ہونے لگیں ۔۔۔(مرقات ۱/۲۶۳) یہی بات اس سے اوپر کہی گئی ہے جس میں ایمان ویقین کو اور اس کی طرف توجہ کو بنیاد قرار دیا ہے۔

☜ **تَنبُّہ:** درجات معرفت کی اس تفصیل میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تین درجات بالترتیب ہیں۔لیکن یہ بات بھی ذہن نشین ہو کہ وہ صعودی ترتیب ہے۔یعنی پہلا درجہ اگر چہ فرض ہے لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کی معرفت سے اس کا مقام ومرتبہ کم ہے، اس طرح دوسرے کا مقام تیسرے کے مقابلے میں کم ہے۔خلاصہ یہ کہ تیسرے درجے کی معروفت کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔اس طرح درجات کا فرق آگے پیر و مرید کی معرفت میں فرق کے بیان میں دیکھ سکتے ہیں۔

مزید درجات

اس کے بعد کے درجات آدمی کے کسب معرفت اور اس کی جدوجہد پر موقوف ہوں گے۔جس کو معرفتی جدوجہد میں جتنی دسترس حاصل ہوگی معرفت میں اس کا درجہ اتنا ہی بلند ہوگا۔

کیوں کہ اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق ومعرفت ۔۔۔ ایمان ویقین ۔۔۔ اخلاص واستقامت ۔۔۔ تزکیہ وتہذیب ۔۔۔ اور کامل اتباع سنت اور فنا فی الشریعت، وہ حقیقی مقاصد ہیں جن کے لیے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے بل کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ’’طَرِیۡقُ الۡوُصُوۡلِ اِلَی اللہِ بِعَدَدِ اَنۡفَاسِ الۡخَلَائِقِ‘‘ (مرقات ۱/۲۷۹ باب العلم)۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔’’ مَنِ انۡکَشَفَ وَلَوِ الشَّیۡئُ الۡیَسِیۡرُ لَہٗ بِطَرِیۡقِ الۡاِلۡھَامِ وَالۡوُقُوۡعِ فِی الۡقَلۡبِ مِنۡ حَیۡثُ لَایَدۡرِیۡ فَقَدۡ صَارَ عَارِفًا بِصِحَّۃِ الطَّرِیۡقِ،

وَلَمْ يَرَهُ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِهٖ قَطُّ، فَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّؤْمِنَ بِهٖ، فَاِذَنْ دَرَجَةُ الْمَعْرِفَةِ فِيْهِ غَزِيْرَةٌ جِدًّا

[1] (طیبی ۱/۴۱۵)۔اب اس کی آپ بہت سی مثالیں پا سکتے ہیں۔

پہلی مثال : مثلاً اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس پر من جانب اللہ بطور تنبیہ کوئی مصیبت واقع ہوا اور اس کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو، یا کسی نیکی کے کام پر مسرت اور بدی پر قلق وافسوس ہو (جیسا کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر ہے) تو ان سب صورتوں میں رجوع یا مسرت وافسوس بھی معرفت کی دلیل ہوگی۔

دوسری مثال : اسی طرح مدرس کو اپنی تدریس۔۔۔امام کو اپنی امامت۔۔۔مدرس کو مطالعہ کرنے۔۔۔طلباء کو قابل بنانے۔۔۔اور تفسیر وحدیث وفقہ کی ترجیح میں۔۔۔اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ رہے تو یہ بھی اضافۂ معرفت کا سبب ہوگا۔ اس کو سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہیں اسے دکھانے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین نہیں ہے کہ تم دیکھنا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم نے فرمایا: اے اللہ یقین تو ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں (سورۂ بقرہ ۲۶۰) دیکھئے رویت سے پہلے اور بعد کے تطمین قلب میں فرق معلوم ہوا۔ اس طرح معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔

روح المعانی میں ''دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ '' (سورۃ

---

[1] اوپر الہام کا ذکر آیا ہے تو اس کو اور فراست کو سمجھ لیں۔ الہام ایسے علم حق کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ غیب سے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالے۔ ''قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ۔ اور فراست ایسے علم کو کہتے ہیں جو غیب سے منکشف ہو لیکن اشیاء وصور کے آثار پر غور وتدبر کے ذریعہ۔ پس دونوں میں فرق یہ ہوا کہ فراست میں امور غیبیہ کا کشف صورتوں کے آثار کے واسطے سے ہوتا ہے اور الہام میں ان کا واسطہ نہیں ہوتا (مرقات ۱/۲۶۴)۔

یونس ۱۰) کے تحت لکھا ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض ''رسائل فی الکلام'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تفاوت کی وجہ سے اہل جنت کے درجات مختلف ہوں گے۔

فرمایا : عوام مؤمنین جنت میں علمی مرتبہ میں علماء ''فی الدنیا'' کی طرح ہوں گے۔ اور علماء انبیاء علیہم السلام ''فی الدنیا'' کی طرح۔ اور انبیاء علیہم السلام ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس علمی بلند مقام پر ہوں گے۔ 'لَاتَکُوْنُ لِمَلَكٍ مُقَرَّبٍ وَلَانَبِیٍّ مُرْسَلٍ ' وَیُمْکِنُ اَنَّ یَکُوْنَ ذٰلِكَ الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدَ ''۔ پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ اہل جنت اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات سلبیہ وصفات اکرام کی غیر متناہی سیر ومعرفت حاصل کریں گے (روح المعانی ۱۱/۱۰۳)۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کو کسی مسئلہ میں کوئی اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے۔ ''یَامُعَلِّمُ ابراھیمَ فَهِّمْنِیْ '' اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما۔ (العقود الدریۃ ۶) اور یہ بھی فرماتے۔ ''فَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اَلْفَ مَرَّةٍ اَوْ اَکْثَرَ اَوْاَقَلَّ حَتّٰی یَنْشَرِحَ الصَّدْرُ وَیَنْجَلِیَ اِشْکَالُ مَا اَشْکَلَ ''۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مناجات کے کلمات پر غور کیجیے۔ ''یَارَبِّ عَرَفْتُ حَقَّ الْمَعْرِفَةِ، وَمَا عَبَدْتُّكَ حَقَّ الْعِبَادَةِ فَهَبْ لِیْ نُقْصَانَ الْخِدْمَةِ بِکَمَالِ الْمَعْرِفَةِ '' (عقود الجمان ۲۲۰)۔

⬅ تیسری مثال: اگر کسی خوش نصیب کو روزمرہ کے پیش آنے والے مخلوقات کے واقعات سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ومیلان کا سامان میسر ہو تو یہ ان مذکورہ تمام درجات میں بڑھا ہوا درجہ مفہوم کیا جائے گا۔

کیوں کہ دنیا آدمی کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہے، لیکن اس خوش نصیب نے

اس کو بھی معرفت خداوندی کا ذریعہ سمجھا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اور ہماری ذات کے درمیان وصول سے پردے مانع ہیں جن کو ہٹا کر اس تک پہنچنے کا امر ہے جو جتنے پردے اٹھاتا جایئے گا اتنا وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا۔ ان پردوں کا ہٹانا اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کی معرفت ہی سے ممکن ہے نہ کہ ذات سے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ " میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا حضرت شیخؒ نے فضائل درود میں ۷۶۵ پر یہ دوسروں کا حال بیان کیا ہے [1]۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ "اَنَّہٗ رَاٰی شَخْصاً یَلْعَبُ فَوْقَ الْحِبَالِ فَقَالَ اِنَّ ھٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَصْحَابِنَا ، لِاَنَّہٗ یَاْکُلُ الدُّنْیَا بِالدُّنْیَا، وَاَصْحَابُنَا یَاْکُلُوْنَ الدُّنْیَا بِالدِّیْنِ " (مرقات ۱/۲۸۷ باب العلم)۔ اسی طرح ایک بزرگ کا قول "اَعْرِفُ ذٰلِکَ فِیْ خُلُقِ دَابَّتِیْ وَخَدَمِیْ "۔ (۸ دعوت فکر وعمل)۔ اس کو متضاد مثال سے سمجھیے ایک شخص بیت الخلاء میں قضاء حاجت سنت نبوی سے کرتا ہے یعنی بیت الخلاء میں غافل نہیں، جب کہ دوسرا شخص بیت اللہ میں بھی خدا سے غافل ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی بازار میں ذاکر ہے تو کوئی بیت اللہ میں غافل یہ اسی معرفت وعدم معرفت کا نتیجہ ہے۔ کہ ایک کو معرفت حاصل ہے دوسرے کو نہیں۔

---

[1] اللہ تعالیٰ کی ذات اور ہمارے درمیان پردے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ پردے میں ہے، وہ تو ظاہر وباہر ہے " ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ " بل کہ ہم پردے میں پڑے ہوئے ہیں، جس سے ہم اللہ سے دور ہیں۔ وہ بہیمیت وحیوانیت اور خواہشات کے پردے ہیں، جتنے ہم ان کو دور کریں گے اتنے ہم اصل انسان بنیں گے۔ شریعت کے اوامر ونواہی کی وضع اسی بہیمیت سے نکالنے کے لیے ہے (مرقات ۲/۲۲۰)۔ سادات تصوف کے یہاں تو یہ پردے سخت عذاب سمجھے جاتے ہیں۔ "اَلْحِجَابُ اَشَدُّ الْعَذَابِ " (مرقات ۱/۷۶)۔

اسی طرف ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس جملہ سے اشارہ فرمایا ہے۔ ''کُنْ مِمَّنْ یَکُوْنُ فِی السُّوْقِ وَقَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسْجِدِ لَا بِالْعَکْسِ۔'' (مرقات ۱۹۲/۲)۔

مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بازار چوں کہ شر وفساد کی جگہ ہے اس لیے سنت ہے کہ بازار میں یہ کلمہ پڑھ لے۔ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٍ'' حدیث میں اس کے بڑے فضائل مذکور ہیں۔ دس لاکھ نیکیاں لکھی جاتیں ہیں، دس لاکھ گناہ معاف کیے جاتے ہیں دس لاکھ درجات بلند کیے جاتے ہیں اور جنت میں ایک گھر اس کے لیے بنایا جاتا ہے۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ ۲۱۴)۔

بعض صحابہ کے بارے میں ہے کہ وہ کبھی اس کلمہ کا ثواب عظیم حاصل کرنے بازار جایا کرتے تھے۔ پھر حضرت فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ ان کے تقویٰ وذکر نے بازاروں کو بھی مساجد بنا دیا تھا۔ افسوس کہ ہم آخرت کے بازاروں (مسجد) سے بھی کورے واپس جاتے ہیں، نہ دین ہی کی متاع ملتی ہے اور نہ ہی دنیا کی دولت، بل کہ اس سے بھی زیادہ خسارہ یہ ہے کہ وہاں اپنی حسنات کو بھی کھودیتے ہیں (آداب مساجد ۱۳)۔

چناں چہ ایسی معرفت کے ایک دو واقعات ہم ذکر کرتے ہیں تاکہ ان کو پڑھ کر اور سمجھ کر اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس راستے پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ کیوں کہ ولایت ومعرفت کے درجات کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی جدوجہد کرے۔ اہل اللہ لوگوں سے جو ریاضت ومحنت کراتے ہیں ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تم بھی ہماری طرح بن جاؤ اور تم بھی اس درجہ پر آجاؤ جہاں ہم ہیں۔ ان کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہم جہاں ہیں ہم وہیں رہیں اور تم وہی رہو۔ نہیں بل کہ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ تم اپنی اپنی صلاحیت ومجاہدات لے کر

آؤ،اور آگے بڑھتے جاؤ۔

چناں چہ بہت سے مریدین اپنے مرشدین سے، بہت سے تلامذہ اپنے اساتذہ سے سبقت لے گئے ہیں۔لہٰذا ہم بھی اس راستے پر چلنا شروع کریں،راستے پر چلتے ہوئے راستے کی کٹھینائی اور اس کی طویل مسافت سے نہ گھبرائیں۔کیوں کہ راستہ طویل ہے لیکن راستہ کی منزل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے ۔

پیرومرید کی معرفت میں فرق

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ دو طرح سے ہوتا ہے۔

(۱) بسم اللہ سے پہلے (اَبْدَأُ) محزوف مانا جائے یعنی ابدأ باسم اللہ،شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے۔

(۲) بسم اللہ کے اخیر میں (ابتدائی) محزوف مانا جائے یعنی بسم اللہ ابتدائی،اس اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔۔۔

امام صاحب (رازی رحمہ اللہ) دوسرے طریقے کو پسند فرماتے ہیں۔کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام مبارک مقدم رہتا ہے اور یہی بہتر ہے۔جب کہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا (اسم مبارک) مؤخر ہوجاتا ہے۔اس بحث کے ضمن میں امام صاحب نے تفسیر کبیر میں ایک واقعہ جو معرفت سے تعلق رکھتا ہے ذکر کیا ہے۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (شیخ ضیاء الدین۔رحمہ اللہ تعالیٰ) سے سنا وہ فرماتے تھے کہ مجھ سے شیخ ابو القاسم انصاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ شیخ ابو سعید بن ابو الخیر،حضرت ابو القاسم قشیری رحمہا اللہ تعالیٰ کے ہم راہ تشریف لائے،گفتگو کے دوران حضرت قشیری

نے فرمایا: علمائے محققین کا یہ مقولہ ہے "مَارَأَیْنَا شَیْئًا اِلاَّ وَرَاَیْنَا اللّٰہَ بَعْدَہٗ" ہم نے جو چیز بھی دیکھی تو اس چیز کو دیکھنے کے بعد اس میں اللہ کو ضرور دیکھا۔ استاذ قشیری کے اس ارشاد کے بعد شیخ ابو سعیدؒ نے فرمایا۔ "ذٰلِکَ مَقَامُ الْمُرِیْدِیْنَ" یہ تو مریدوں کا رتبہ ہے یعنی یہ تو ادنیٰ درجہ ہے، لیکن مرشدین کاملین کا مقام سنو "فَاِنَّھُمْ مَارَاَوْا شیئاً اِلَّا وَکَانُوْا قَدْ رَأَوُاللّٰہَ قَبْلَہٗ" وہ تو ان چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو دیکھ چکے ہوتے ہیں پھر دنیا کی چیزیں دیکھتے ہیں۔

اس واقعہ سے امام صاحب نے بسملہ میں بسم اللہ سے ابتدا کو بہتر سمجھنے پر استدلال کیا ہے۔ کیوں کہ اس میں ابتداء اللہ کے اسم مبارک سے ہے یعنی خالق سے ابتداء ہے جب کہ اس کے علاوہ صورت میں اسم مبارک مؤخر ہو جاتا ہے (اور ابتدا مخلوق سے ہوتی ہے)۔

اس کو علمی اصطلاح میں یوں کہیں کہ اس واقعہ میں اول مرید کے طریقے میں مخلوق (کی معرفت) سے خالق کی طرف انتقال ہے جس کو برھان اِنِّی کہتے ہیں۔ اور مرشد کے طریقے میں خالق (کی معرفت) سے مخلوق کی طرف انتقال ہے جس کو برھان لِمِّی کہتے ہیں اور برہان انّی سے لمّی افضل واشرف ہوتی ہے۔ خیر واقعۂ مذکورہ سے معرفت کی دو راہیں اور دو مرتبے معلوم ہوئے (تفسیر کبیر ج۱/۱۰۱، طبع ثالث)۔ یہاں بھی بعد والے درجہ کا مرتبہ پہلے درجے سے بلند ہے۔

عند اللہ اپنا درجہ معلوم کرنے کا طریقہ

امام رازیؒ نے معرفت پر ایک زریں جملہ ارشاد فرمایا ہے پڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سے نوازیں یہاں ایک مختصر جملہ سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عند اللہ ہمارا کیا مقام و درجہ ہے فرمایا: اِنَّ جَنَّۃَ الْمَعْرِفَۃِ خَیْرٌ مِنْ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ (تفسیر کبیر ج ۱/۱۷۷)۔ کہ معرفت کی جنت، نعمتوں والی آخرت کی جنت سے بہت بہتر ہے۔ اس

جملے میں دواہم نکتوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) ایک یہ کہ آخرت کی جنت میں جنتی آدمی کو جو لطف آئے گا اس سے زیادہ لطف دنیا میں عارف کو معرفت حاصل ہونے میں آتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ دنیا میں جس کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت حاصل ہوتی ہے اتنا اس کا مقام بلند ہوتا ہے یعنی اللہ کی معرفت کا حاصل ہونا عنداللہ اپنے مقام ومرتبہ پہچاننے کے لیے معیار ہے۔

اور یہی بات امام قرطبیؒ تحریر فرماتے ہیں ''مَثَلُ السُّنَّۃِ فِی الدُّنْیَا کَمَثَلِ الْجَنَّۃِ فِی الْعُقْبٰی، مَنْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ فِی الْعُقْبٰی سُلِّمَ کَذٰلِکَ مَنْ لَزِمَ السُّنَّۃَ فِی الدُّنْیَا سُلِّمَ ۔(قرطبی ۱۳/۳۶۵)۔

ترجمہ: جو مقام و درجہ اخروی زندگی میں جنت کو حاصل ہے دنیوی زندگی میں وہ نبوی سنتوں کو حاصل ہے۔لہٰذا جس طرح کوئی شخص اخروی جنت میں محفوظ وسالم رہتا ہے بس اسی طرح دنیوی زندگی میں سنتوں پر چلنے والا بھی شرور وآفات سے محفوظ رہتا ہے۔جس طرح امام رازیؒ نے بلند مقام کا معیار معرفت کو قرار دیا تھا بس اسی طرح یہاں سنت نبوی کو معیار قرار دیا ہے۔کہ دنیا میں جس کی زندگی میں جتنی سنتیں ہوں گی اس قدر عنداللہ اس کا مقام بلند ہوگا۔اللہ اکبر!! کتنی بڑی باتیں ہیں اللہ تعالیٰ ان سے ہمیں نوازیں۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تین علامتیں

حضرت شیخ ابراراحمد دھلیوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رب اکرم کی خوشنودی کی تین علامتیں ہیں مطلب جن سے اللہ پاک خوش ہوتے ہیں ان کو تین دولتیں مرحمت فرماتے ہیں۔

(۱) دولت : دین کی سمجھ اور دین کی فہم ہے۔ ہر لائن کی ایک سمجھ ہوتی ہے ہر

لائن کا ایک شعور ہوتا ہے اس کا تجربہ اس کی بصیرت ومہارت ہوتی ہے جیسے ڈاکٹری، انجنیئر ی، وکالت، سائنس وغیرہ ایسے ہی دین کی بھی ایک سمجھ ہوتی ہے۔۔۔ علماء لکھتے ہیں کہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ خدائے پاک کا اس کے لیے کیا ارادہ ہے؟ مگر جس کو رب اکرم نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہو اس کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھلائی چاہتے ہیں۔'' مَنۡ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیۡرًا یُّفَقِّہۡہُ فِی الدِّیۡنِ ''۔

(۲) دولت وعلامت: دنیا سے دل کا فارغ ہو جانا، بے رغبت ہو جانا۔ کیوں کہ قلب کا کام معرفت کا ہے کہ وہ رب العالمین کو پہچانے۔ اگر قلب میں دنیا ہے تو معرفت ربّ حاصل نہ ہوگی۔

(۳) علامت: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو اس کے عیوب اور اس کی کمزوریوں پر مطلع فرما دیں کہ اس کو اپنی برائیاں نظر آئیں، غیروں کی نہیں۔ جب کہ آج ساری دنیا کا حال اس کے برعکس ہے (فیض ابرار ۲/۲۹۴)۔

برف سے شرف تک

جیسے ہم نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص روزمرہ کے واقعات پر عبرت ومعرفت کی نگاہ ڈالے تو دنیوی احوال سے بھی اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا سامان میسر ہوسکتا ہے اور اصلاح زندگی کی توفیق حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی کو سمجھانے کے لیے ایک بزرگ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ اس طرف ہمارا بھی دھیان ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی تو جایا کرے۔

حضرت شیخ ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب فیض ابرار میں ایک بزرگ کا بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے مریدین میں سے ایک نے یہ پوچھا کہ

حضرت آپ کو یہ ولایت کیسے ملی؟ حضرت نے فرمایا اس طرح کہ میں ایک مرتبہ راستہ پر سے گزر رہا تھا میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں برف کی سِل اٹھائے ہوئے تھا اور وہ یہ آواز دے رہا تھا ’’اے اللہ کے بندو مجھ پر رحم کرو اور مجھ سے یہ برف خرید لو۔ کیوں کہ میرا ہر لمحہ گھاٹے میں گذر رہا ہے‘‘ (کیوں کہ برف ہر لمحہ پگل کر پانی بن جاتی ہے) تو میں نے غور کیا کہ اس کا تو ہر لمحہ صرف دنیوی گھاٹے میں گزرتا ہے، لیکن میرا تو ہر لمحہ اُخروی گھاٹے میں گزرتا ہے۔ تب سے میں نے یہ طے کیا کہ اب ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کروں گا اور اس عہد پر میں ہمیشہ قائم رہا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس برف والے سے (ولایت کا) یہ شرف بخشا۔ یہ ہے برف سے شرف تک۔ اللہ تعالیٰ ہماری نگاہِ عبرت کو کھول دے اور اپنا مقرب بنادے۔ آمین۔

اولیاء اللہ اور ان کے کچھ درجات

بحث معرفت کے بعد مناسب ہے کہ اولیاء کے درجات کی کچھ تفصیل پیش کی جائے تا کہ ہم میں بھی بلند ہمتی آئے اور اس راستے پر ہمارے بھی قدم اٹھیں چاہے جس قدر بھی ہو۔ حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے کہ علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ نبوت تو وہبی ہے اور ولایت کسبی۔ ان کی مثال اس طرح سمجھئے کہ نبوت ورسالت کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی خاص قسم کا گریڈ (درجہ) ہو جو حاکم کی طرف سے ملے۔ اور ولایت کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی ڈگری ہو جس کو آدمی کوشش کر کے حاصل کرے۔

مطلب ولایت کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن نبوت ورسالت کا حاصل کرنا دشوار ہی نہیں بل کہ ناممکن ومحال ہے۔ اور محققین نے لکھا ہے کہ ولایت بھی اللہ ہی کے فضل سے ملتی ہے۔ البتہ اسباب ولایت کسبی ہیں، مثلاً اتباع سنت، تقویٰ اور ذکر اللہ کی کثرت اور معرفت کا

حاصل کرنا وغیرہ۔(فیض ابرار ۱۴۶/۴) اللھم ارزقنا منہا۔

ولی کون ؟

شرح عقائد میں ہے ’’وَالْوَلِیُّ ھُوَ الْعَارِفُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی وَصِفَاتِہٖ حَسْبَ مَا یُمْکِنُ، الْمَوَاظِبُ عَلَی الطَّاعَاتِ المجتَنِبُ عَنِ الْمَعَاصِیْ اَلْمُعْرِضُ عَنِ الْاِنْہِمَاکِ فِی اللَّذَّاتِ وَالشَّھَوَاتِ‘‘ (شرح عقائد ۱۰۵)۔ ولی وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی اور اس کی صفات کی جس قدر ممکن ہو معرفت حاصل ہو جو عبادات کا پابند ہو، معاصی سے اجتناب کرنے والا ہو، لذات وشہوات میں انہماک سے کنارہ کش ہو۔

ولی کی مذکورہ تعریف بالکل واضح ہے۔ البتہ ’’حسب استطاعت بمعنی قدر امکان، کچھ محتاج تفصیل ہے۔ ملا عصام الدین نے حاشیہ میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ لکھا ہے کہ حصول معرفت بحسب استطاعت میں دو احتمال ہیں، پھر دونوں پر اعتراض کیا ہے اور جواب بھی دیا ہے۔

(۱) حصول معرفت بحسب استطاعت سے مراد اگر ’’استطاعت بالنوع یعنی نوع ولی‘‘ کے لیے استطاعت کا ممکن ہونا مراد ہو اور مطلب یہ ہو کہ نوع ولی کے لیے جو استطاعت ممکن ہو وہ اگر کسی کو حاصل ہو تو وہ ولی ہوگا۔ تو اس سے افضل نوع (یعنی فرد کامل) کی ولایت تو ثابت ہوگی لیکن غیر افضل نوع کے ولایت کی نفی لازم آئے گی۔

(۲) اگر استطاعت بالمعرفت سے معین شخص کی استطاعت مراد ہو کہ کوئی بھی مخصوص شخص اپنی بساط کے بقدر معرفت حاصل کرے تو وہ ولی ہوگا۔ تو اس سے لازم یہ آئے گا کہ وہ شخص ولی نہ ہو جو وقت ضائع کر دے باوجودیکہ اس کا معرفت سے تعلق اور اس سے شغل ہے۔ اس لیے کہ اس

نے اپنی استطاعت کے بقدر معرفت حاصل نہیں کی کیوں کہ اگر وہ اس وقت کو معرفت میں صرف کرتا تو مزید معرفت حاصل ہوتی۔

لیکن اس احتمال ثانی میں اس محروم شخص کی ولایت بھی تھوڑی سی تبدیلی سے ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ ولایت کا مدار تضییع اوقات پر نہ ہو بل کہ اس کا مدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطف عطا کرنے اور اسے حاصل کرنے پر ہو۔ اور مطلب یہ ہو کہ اس فائت الوقت کو ایک عرصہ تضییع اوقات کے بعد من جانب اللہ توبہ کی توفیق حاصل ہوجائے جس سے اب تا موت معرفت حاصل کرنا ممکن رہے۔ گویا حسب استطاعت کا تعلق توفیق توبہ کے بعد سے ہے کہ اس کے بعد پورا وقت معرفت میں صرف کرے اور یہ سلسلہ خاتمہ تک برقرار رہے تو وہ ولی ہوگا اگرچہ قبل التوبہ ولایت کا اہل نہیں تھا۔ واللہ اعلم (حاشیہ ملا عصام شرح عقائد ۱۰۵)۔

ولی کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص ہے جس کے معاملات کا اللہ تعالیٰ متولی ہوگیا ہو۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کی تولیت میں رہتا ہو۔ ایک لحظہ کے لیے بھی اس کے نفس کے حوالے نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں ایسا مشغول رہے کہ عصیان کا گزر ہی نہ ہو۔ ''بِعِبَادَۃٍ تَجْرِیْ عَلَیْہِ عَلَی التَّوَالِیْ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَتَخَلَّلَھَا عِصْیَانٌ'' (حاشیہ نبراس محمد برخوردار ۴۷۵)۔ ملا جامی نفحات میں فرماتے ہیں کہ ولی وہ ہے جو مشاہدۂ حق میں ایسا مستغرق ہو کہ اپنے نفس کی بھی خبر نہ ہو اور غیر اللہ کے ساتھ قرار نہ ہو۔

قرآن شریف کا ارشاد ہے ''اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○'' ۔ (یونس ۶۲،۶۳)۔ روح المعانی میں ہے کہ ولی کی جمع اولیاء ہے ولی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے ایک مخصوص قرب ونزدیکی حاصل ہو۔ اس کے بعد انہوں نے ایک درجہ بیان کرنے کے بعد، دوسرے درجات مختلف شرائط وقیود کی رعایت اور ان پر اعتراض

وجواب کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) سب سے کم رتبہ ولی وہ ہے جو فرائض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے والا ہو۔ ''اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' (سورۃ بقرہ ۲۵۰)۔

(۲) درجہ آیت بالا میں ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ'' سے معلوم ہورہا ہے۔ جب اس کو ''جملہ مستانفہ'' مانیں تو یہ جملہ خود اولیاء کی تفسیر بنے گا، اور مطلب یہ ہوگا کہ اولیاء وہ ہیں جو مومن ومتقی ہوں۔

لیکن تقویٰ کے بھی مختلف درجات ہیں۔

الف : اگر تقویٰ سے مراد ایسا کامل تقویٰ مراد ہو جس کو قرآن نے ''اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ'' سے بیان کیا ہے جس میں کامل استغراق بالحق پایا جائے جو شہود حق اور اس کے حضور وقرب کا باعث ہو تو یہ درجہ صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہوگا۔ کیوں کہ ایسا تقویٰ جو کامل استغراق وشہود کا سبب ہو یہ صرف انبیاء ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اب ''اَوۡلِیَاءَ اللّٰہِ۔ اَنۡبِیَاءَ اللّٰہِ'' کے معنی میں ہوگا۔ تو اب کہیں گے کہ ابنیاء علیہم السلام، نبوت وولایت دونوں کے جامع ہیں۔

ب : اگر کامل استغراق سے کم رتبہ تقوی کا مراد لیں تو یہ درجہ مومن متقی کا ہوگا۔

(۳) اگر آیت بالا کا مذکورہ جملہ، مستانفہ نہ مانیں بل کہ ''اولیاء کی صفت'' قرار دیں تو پھر مذکورہ بالا درجات اس جملہ سے ثابت نہ ہوں گے، لیکن یہ احتمال غیر وزنی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ وَلِیٌّ بروزن فَعِیلٌ میں دو احتمال ہیں۔ یا تو بمعنی فاعل ہو یا بمعنی مفعول، بہر دو صورت ولی کی تفسیر یہ ہوگی کہ ولی وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی تولیت میں رہے اور وہ مسلسل طاعت وعبادت پر قائم رہے۔ (امام قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں وصف (تولیت یعنی دیکھ بھال اور مسلسل طاعت) ولایت میں شرط ہیں۔ مگر ہاں اللہ تعالیٰ کی

تولیت کا وصف، مجذوب میں اور تسلسل طاعت کا وصف، مرید سالک میں غالب ہوتا ہے)

یہ مذکورہ تفصیل اس پر دال ہے کہ معصیت منافئ ولایت ہے کہ اگر کوئی گناہ پیش آ گیا تو وہ ولی نہیں رہ سکتا۔ یعنی ولایت کے لیے عصمت شرط ہے۔ چناں چہ اکثر حضرات اسی کے قائل بھی ہیں۔

لیکن اس پر اعتراض ہوگا کہ عصمت صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے غیر نبی کے لیے اہل حق عصمت کے قائل نہیں۔ دوسری طرف اہل حق غیر نبی کے ولی ہونے کے بھی قائل ہیں پھر تو دونوں میں جمع و تطبیق مشکل ہے۔ اسی لیے بعض حضرات نے یہ کہہ کر اس سے چھٹکارہ حاصل کر لیا کہ اولیاء اگر چہ معصوم تو نہیں ہوتے ان میں صدور معصیت کا امکان رہتا ہے پھر بھی وہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔

اکثر حضرات کے برخلاف عند البعض معصیت منافئ ولایت نہیں (فلا حاجة الی قیل وقال)۔ ان بعض کی دلیل یہ کہ حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا "ھَلْ یَزِنِیْ الْعَارِفُ؟" تو فرمایا "نَعَمْ" "وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَراً مَّقْدُوْراً"۔ لیکن فریقِ اول اس دلیل کا یہ جواب دیتا ہے کہ حضرت جنیدؒ کا جواب اور سائل کا سوال دونوں امکان معصیت پر محمول ہیں وقوع سے بحث نہیں۔ ادھر یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ غیر نبی میں صدور معصیت کا امکان ہوتا ہے۔ اور منافئ ولایت وقوعِ معصیت ہے نہ کہ اس کا صرف امکان۔

یہ بات یقینی بھی ہے اور اتفاقی بھی، کہ ولی سے جب صدور معصیت ہو تو وہ ولی نہ رہے گا۔ کیوں کہ ولایت کا مدار ہی تقویٰ پر بل کہ ایمان پر ہے (کوئی غیر متقی و غیر مؤمن ولی ہو نہیں سکتا) جب صدور معصیت سے تقویٰ و ایمان دونوں متأثر ہوتے ہیں تو ولایت کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بعض نے ولایت کی اس طرح دوقسمیں کی ہیں۔(۱)ولایت صغریٰ۔(۲)ولایت کبریٰ۔

(۱) ولایت صغریٰ وہ ہے جس میں ذنب (گناہ) کا صدور ہو لیکن کبھی ہو اور بہت جلد اس سے باز آ جائے۔ **علامہ ابن حجر** رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ وقوع ذنب منافی عصمت نہیں لہٰذا وقوع کے باوجود ولایت منقطع نہیں ہوگی۔ ہاں منافیٔ عصمت، وقوع کا تکرار اور اس کی کثرت ہے، اور وقوع کے بعد اس سے باز نہ آنا ہے۔

(۲) ولایت کبری وہ ہے جس میں ذنب کا وقوع بالکل نہ ہو البتہ اس کا امکان رہتا ضرور ہے۔ **علامہ آلوسی** صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس تقسیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ صغری وکبریٰ کی تقسیم ہے تو اچھی، لیکن اس سے بہت سوں (نااہل) کے لیے ولایت کے دعویٰ کا دروازہ کھل سکتا ہے واللہ اعلم۔ (روح المعانی ۱۹۶ تا ۱۱/ ۱۹۷)۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحبؒ نے بھی معارف القرآن میں قدرے تفصیل بیان کی ہے لیکن وہ سب ہی مذکورہ تفصیل کے تحت آ جاتی ہے اس لیے ہم صرف اس کا خلاصہ پیش کر دیتے ہیں۔

ایک ہے ولایت خاصہ اور ایک ہے ولایت عامہ۔ ولایت خاصہ کے درجات۔

(۱) خدا سے ایسا کامل تقرب جس کی وجہ سے بندہ کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی عنایت وتوجہ کے تابع ہو جائے (جیسا کہ حدیث قدسی میں بندے کے کان وغیرہ اعضاء بننے کا ذکر ہے) یہ ولایت خاصہ ہے۔ پھر اس کے بے شمار درجات ہوں گے۔ سب سے اعلی درجہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پھر دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا۔

(۲) اسی ولایت خاصہ کا ادنی درجہ ولایت عامہ کا ہے۔ جس کو اصطلاح صوفیاء میں درجہ فنا کہا جاتا ہے۔ اس فنا کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

(الف) : کسی سے محبت وبغض اور دوستی اور عداوت کا صرف اللہ کے لیے ہونا۔

(ب) : ہر حال میں احکام کی اطاعت۔ یہ دو وصف ولایت کی گویا شرط ہیں۔ ایک بھی فوت ہو تو وہ اس درجہ میں شامل نہ ہوگا۔ یہ دو شرط جس میں ہوں گی وہ ولی اللہ کہلائے گا۔ اب اس میں بھی اعلیٰ وادنی کئی درجات ہوں گے۔

(۱) جس میں وہ دونوں وصف جس قدر اعلیٰ ہوں گے اس قدر ولایت میں اس کا درجہ اعلی ہوگا۔

(۲) اوسط میں اوسط

(۳) ادنی میں ادنی۔ مطلب درجہ فنا میں بھی کچھ درجات ہیں۔

علامتیں : ولایت کی کچھ علامتیں مذکور ہیں۔

(۱) محبت وعداوت صرف اللہ کے لیے ہو۔ (لیکن صرف اللہ کے لیے ہونے کو معمولی نہ سمجھا جائے وہ بھی محتاج تفصیل ہے۔ مطلب ہر ہر چیز میں محبت وعداوت صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو نفس کا ذرا بھی دخل نہ ہو)۔

(۲) علامت حدیث قدسی میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندوں میں سے میرے اولیاء وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں۔

خلاصہ جن کو دیکھنا اور جن کا تذکرہ یاد الٰہی کا ذریعہ ہو۔ مطلب جن کے ساتھ رہنے سے جن کی ملاقاتوں سے اللہ تعالیٰ کی یاد وذکر کی توفیق حاصل ہو اور دنیوی فکروں میں کمی محسوس ہو آخرت کی طرف رغبت ہو وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہیں (معارف القرآن ۵۴۸/۴)۔

(۳) کامل متبع سنت ہو۔

(۴) جن کا ظاہر سر سجدے میں، زبان ثناء میں، دل ذکر میں، روح فکر میں، ہاتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح سخاوت میں، آنکھ معرفت کے دیکھنے میں، قدم مسلمانوں کی زیارت میں، کان

کلام الٰہی کے سننے میں اور معروفات پر کمر بستہ ہو۔ (مفتاح العارفین حضرت سلطان باہو ۱۵)۔

تَنَبُّه: بحث ولایت میں ذکر اللہ سے ایسا ذکر ہرگز مراد نہیں کہ زبان تو ذاکر ہو اور دل غافل ہو۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نوافل اور اذکار و اوراد سے قلب میں جو انوار پیدا ہوتے ہیں اس سے ایک روحانی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس طاقت کا استعمال بارگاہ خلوتِ حق میں نہیں ہے بل کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا، (۲) بے جا غصہ کو ضبط کرنا، (۳) بدنظری سے آنکھوں کو محفوظ رکھنا، (۴) مخلوق کی خطاؤں کو معاف کرنا، (۵) شہوت اور غضب سے مغلوب نہ ہونا، (۶) کسی کو حقیر نہ سمجھنا، (۷) انتقام نہ لینا، (۸) اپنے کو مخلوق خدا کا خادم سمجھنا، (۹) مؤمن کا اکرام کرنا، (۱۰) اپنے کو بڑا نہ سمجھنا وغیرہ میں ہے۔ اگر خلوت میں ذاکر و شاغل ہے اور مخلوق خدا پر ظالم اور مغلوب الغضب ہے تو اس نے روحانی طاقت کا صحیح استعمال نہیں کیا (کشکول معرفت ۵۱۵)۔ حضرت نے واقعی بڑی عمدہ باتیں فرمائیں۔

اولیاء اللہ کے مختلف درجات

ویسے اولیاء کے مختلف درجات کی کچھ اصطلاحات بھی ہیں جو تصوف و سلوک کی کتابوں میں زیر بحث آتی ہیں۔ مثلاً: غوث، قطب، ابدال، نقباء، نجباء، اوتاد، قطب مدار اور قطب ارشاد وغیرہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

یہ درجات، لطائف سبعہ پر مرتب ہیں (نقشبندیہ)۔

(۱) لطیفۂ اول قلب ہے۔ جس کے سالک کا نام ''بدرالدین'' بنتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ میں سے

ایک ولی ہوتا ہے۔

(۲) لطیفۂ دوم روحی ہے۔جس کے سالک کا نام ''نجم الدین'' بنتا ہے۔وہ نقباء اولیاء اللہ میں سے ایک نقیب ہوتا ہے۔

(۳) لطیفۂ سوم سرّی ہے۔جس کے سالک کا نام ''نورالدین'' بنتا ہے۔وہ نجباء اولیاء اللہ میں سے ایک نجیب ہوتا ہے۔

(۴) لطیفۂ چہارم سِرُّ السِرّی ہے۔جس کے سالک کا نام ''شمس الدین'' بنتا ہے۔وہ ندبا اولیاء اللہ میں سے ایک ندیب ہوتا ہے۔

(۵) لطیفۂ پنجم خفی ہے۔جس کے سالک کا نام ''حسام الدین'' بنتا ہے۔وہ ابدال اولیاء اللہ میں سے ایک بدل ہوتا ہے۔

(۶) لطیفۂ ششم اِخفا ہے۔جس کے سالک کا نام ''جمال الدین'' بنتا ہے۔وہ اوتاد اولیاء اللہ میں سے ایک وتد ہوتا ہے۔

(۷) لطیفہ ہفتم قدسی ہے۔جس کے سالک کا نام ''کمال الدین'' بنتا ہے۔وہ قُطُبُ وغوث اولیاء اللہ میں سے ایک قُطُب ہوتا ہے۔(مفتاح اللطائف حضرت خواجہ محمد اسلم ۳۳تا۴۹)۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے فرمایا گیا ہے کہ آپ مجموعہ ''قطب مدار'' یعنی باعث بقاء جان عالم اور ''قطب ارشاد'' یعنی باعث بقاء ایمان عالم تھے[۱]۔(کتاب جواہر مجددیہ سوانح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ۴۹)۔

---

[۱] نیز معرفت کے تین درجات ہیں (۱) واحدیّت، (۲) وحدت، (۳) احدیّت۔مرتبہ احدیت تمام مراتب کی جائے صدور ہے (مفتاح اللطائف ۴)۔

پیر چار طرح کے ہوتے ہیں۔(۱) پیر بیعت۔(۲) پیر خرقہ، (۳) پیر ارشاد، (۴) پیر صحبت۔(ترجمہ انتباہ المریدین ۷ حضرت شیخ محمد چشتیؒ)۔

(۷) ذاتی اصلاح سب امور سے مقدم ہے

کسی بھی اجتماعی کام کا مبدأ، فردوذات ہوتا ہے یعنی اصول یہ ہے کہ ہر کام ذات سے شروع ہوکراوروں تک اور جماعتوں تک پہنچتا ہے۔ دوسروں کوکسی خطرے سے وہ ہی بچاسکتا ہے جوخود اس خطرے سے محفوظ ہو۔ دوسروں کو وہی سنوار سکتا ہے جو پہلے اپنے کوسنوارے۔ اسی بات کوسمجھنے کے لیے قرآن کریم کے ارشاد کو پڑھئے اورغور کیجئے۔ ’’اَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ ۔۔الخ آیۃ‘‘ (نساء ۷۷)۔ (اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جن کو یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رکھو اور ’’پہلے‘‘ نماز قائم کرو اور زکات دیا کرو پھر ان پر جہاد فرض کیا گیا تو۔۔۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اللہ تعالی نے اس آیت کریم میں پہلے نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کا حکم دیا۔ جونفس کا جہاد ہے پھر جہاد بالسیف کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ جہاد بالنفس مقدم ہے جہاد بالسیف پر یعنی ذاتی اصلاح مقدم ہے (روح المعانی ۵/۱۱۲)۔ اور حضرت مفتی محمد شفیع ؒ صاحب فرماتے ہیں کہ پہلے نماز اور زکات کے احکام کو بیان فرمایا جو اصلاح نفس کا سبب ہے اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اصلاح ملک کا سبب ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ چناں چہ درجہ کے اعتبار سے قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور قسم ثانی کا فرض کفایہ۔ (معارف القرآن ۲/۴۸۲)۔ اسی طرح کی بات حدیث شریف سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

’’عَنْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ بَابٌ مِنَ الْعِلْمِ يَحْفَظُهُ الرَّجُلُ لِصَلَاحِ نَفْسِهٖ وَصَلَاحِ مَنْ بَعْدَهٗ أَفْضَلُ

مِنْ عِبَادَتِ حَوْلٍ" (طبی ۱/۴۷۳)۔حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدمی کا علم کے ایک باب کو اس لیے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے اور اپنے علاوہ کی بھی اصلاح کرے ایک سال کی (نفلی) عبادت سے بہتر ہے۔اس خبر واثر سے بھی یہ ثابت ہوا کہ پہلے اپنی اصلاح کا درجہ ہے پھر دوسروں کی اصلاح کا۔

ان نصوص کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ امام کو اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ پہلے کرنی چاہیے۔لہٰذا امام پابند شرع کامل متبع سنت، زہد وتقویٰ، صدق وامانت کا پیکر ہو اور وہ شفقت وخیر خواہی کا خوگر ہو کر ھَادِیْ اِلَی الْاِطَاعَۃِ اور جذبہ خلوص سے سرشار ہو کر دَاعِیْ اِلَی السُّنَّۃِ وَالشَّرِیْعَۃِ ہو۔کیوں کہ امامت دیگر دنیوی پیشوں کی طرح کوئی پیشہ نہیں بل کہ ذمہ داری کا ایک اہم منصب ہے جس کے لیے مقتدیوں کی اصلاح کی فکر کے ساتھ خود کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔

کچھ ممالک کی بعض مسجدوں کے اماموں کا یہ حال کہ جب وہ امامت کے لیے جائے نماز پر آتے ہیں تو مصنوعی وضع قطع اختیار کرلیتے ہیں اور فراغت کے بعد انہیں اتار کر رکھ لیتے ہیں۔گویا دنیوی مختلف اداروں کے یونیفارم کی طرح ایک وقتی یونیفارم اور شکل وصورت اختیار کرلیتے ہیں۔یہ امامت نہیں امامت کے نام پر دنیوی پیشہ ہے۔دراصل یہ دشمنان اسلام یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔اَللّٰھُمَّ احفظنا مِنْ ذٰلِكَ۔ افسوس امت رسومات میں اس طرح کھوگئی کہ اس نے اپنی مذہبی عبادتوں اور امامت جیسے پروقار عہدوں کو بھی نہیں بخشا۔

شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال تھا کہ مصلح بننے سے پہلے صالح بننا ضروری ہے۔اس کو اس طرح بیان فرماتے کہ میرے خیال میں اصل مقصود تو ہر شخص کو اپنے نفس کی اصلاح ہے، فرائض وواجبات وعبادات وغیرہ ادا کرتا رہے اور اللہ اللہ کرتا رہے۔اگر اللہ کو

اس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے تو خود اس کی طبیعت کو اس کی طرف متوجہ کردیتے ہیں اور بطریق الہام یا بحکم شیخ اسے کوئی کام سپرد کردیا جاتا ہے۔فرمایا دیکھو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالاں کہ ازکی النفس ہیں مگر آپ کو بھی جب تک مامور من اللہ نہیں کیا گیا غار حرا میں تشریف لے جا کر انفرادی طور پر اللہ کی عبادت کرتے رہتے تھے۔حالاں کہ قوم کی بے اعتدالیاں، بت پرستی اور ظلم وغیرہ دیکھتے تھے مگر کسی سے تعرض نہیں کیا لیکن جب فرشتہ نازل ہوا اور فرمایا "بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ" تو آپ غار حرا کو چھوڑ کر کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے اور اس فرض کو ادا کیا (تزکیہ واحسان ۱۴۹)۔

اصلاح اور حضرت حکیم الامت کی باریک نظر

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی حالت کا علم ہے کہ مجھ میں اصلاح کی کیا ضرورت ہے" بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِہٖ بَصِیۡرَۃٌ وَّلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ " انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہے گو اپنے حیلے پیش کرے۔ یعنی انسان اپنی حالت خوب جانتا ہے کہ وہ بہت سے کام شریعت کے خلاف کرتا ہے لیکن اس کی ظاہری وضع قطع اور نماز وروزہ کی وجہ سے لوگ اس کے معتقد ہو جاتے ہیں تو اس سے وہ خود بھی دھوکہ میں پڑ جاتا ہے اور اپنے نفس کا وہ خود بھی معتقد ہو جاتا ہے۔کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ اتنے آدمی مجھے دیندار سمجھتے ہیں گو یا میری دینداری پر اجماع ہو چکا ہے اور اتنے آدمیوں کا اجماع غلط نہیں ہوسکتا۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اجماع کہاں ہوا ہے ابھی ایک مسلمان کا اختلاف باقی ہے اور وہ اختلاف ایسے شخص کا ہے جس کا اختلاف اجماع میں قادح (نقصان دہ) ہے وہ مسلمان کون ہے؟ وہ تم خود ہو۔کیوں کہ تمہارا دل تو جانتا ہے کہ تم دیندار نہیں ہو پھر یہ اجماع کیوں کر حجت ہوسکتا ہے۔

اتنی اور اس کے علاوہ بہت ساری خرابیوں کے ہوتے ہوئے ہم کیسے اپنے آپ کے معتقد ہوسکتے ہیں اور کیسے دیندار ہوسکتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں ۔ " وَلَامُشَاحَۃَ فِیْ الْاِصْطِلَاحِ " اصطلاح مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، سوہم آپ کی اصطلاح میں مزاحمت نہیں کرتے ممکن ہے آپ کے نزدیک دیندار کی بھی دو قسمیں ہوں۔ ایک حقیقی دیندار۔ دوسرا جس کو لوگ دیندار سمجھیں (خطبات حکیم الامت وخیر الاعمال ۵۲۹)۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اہل زمانہ میں مختلف امراض پائے جاتے رہے ہیں۔ آج ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہماری نظر ہمہ تن دنیا پر ہے اس دین پر نہیں جس پر فلاح کا مدار ہے۔ یہ مرض عوام میں بھی ہے اور ان دینداروں میں بھی جو اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں (جن کا ذکر اوپر گزرا)۔ دنیا پر نظر کی وجہ سے ان دونوں کے نزدیک وقعت دنیاداروں کی ہوتی ہے نہ کہ حقیقی دینداروں کی۔

مثلاً ان کے پاس ایک دنیادار آوے اور ایک حقیقی ایسا دیندار آوے جس کو نہ کوئی عزت حاصل ہو نہ مال نہ وہ شیخ و بزرگ ہو نہ وہ اصطلاحی عالم ہو ہاں بقدر ضرورت علم رکھتا ہو اور واقع میں دیندار ہو تو میں بقسم کہتا ہوں جو قدر و وقعت ان کی نظر میں اس دنیادار کی ہوگی وہ اس دیندار کی نہ ہوگی۔

حق یہ ہے کہ نفوس میں عموماً دنیا کی طرف میلان ہے کہ ظاہری جاہ و مال دیکھا جاتا ہے اگرچہ یہ جاہ دین کی وجہ سے حاصل ہو۔ مثلاً بزرگوں میں سے بھی اسی بزرگ کی تعظیم کریں گے جس کی چار آدمی تعظیم کرتے ہوں اس لیے کہ اس کی تعظیم و خدمت کرنے سے عار نہیں ہوگی۔ یہ نفس کا مخفی مکر ہے۔

ظاہراً تو یہ تعظیم و خدمت نہایت صلاح پر دال ہے لیکن اس کا راز اور اس میں نفس کی

چال یہ ہے کہ ان بزرگ کی خدمت اور تعظیم اسی لیے کرتے ہیں تاکہ اس فعل سے لوگوں کی نظر میں اپنی بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ پس یہ تعظیم اپنی ہی تعظیم کے لیے ہے اسی واسطے اس خدمت اور تعظیم سے نفس خوش ہوتا ہے (خطبات ۳۳۰)۔ اللہ اکبر کتنی بڑی بات حضرت نے سمجھائی بالکل صحیح تشخیص فرمائی ہے دکھتی رگ پکڑی ہے۔ بس اللہ کرے ہماری سمجھ میں آجائے۔

حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم اسلام پر رونا رو رہے ہیں لیکن اپنی خبر نہیں لیتے جو لوگ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی خدمت کریں جب وہ خود درست ہوجائیں گے تو اسلام بھی درست ہوجائے گا۔

اسلام کی اصل خدمت یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کرو اور اپنے اعمال واقوال اور اپنے احوال اسلام کے مطابق بناؤ۔ جب تمہاری کامل اصلاح ہوجائے گی تو اسلام کو ترقی حاصل ہو ہی جائے گی۔ ہمارے اعمال کی صورت بھی شریعت کے موافق نہیں تو یہ کیوں کر کہا جائے گا کہ ہمارے اسلام میں صورت اسلام ہے بس یہی کہا جائے گا اسلام نام کا رہ گیا ہے۔

اصلاح کی تدبیر

حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے یہ یقین کرلو کہ جو کام تم خود کو کرنا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے لیے کچھ ہوسکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو طالب کا کام کرنے کیوں کافی نہ ہوجاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ہی کوشش کی کہ ابو طالب ایمان لے آئیں مگر وہ ایمان نہ لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کچھ نہ کرسکیں۔ (خطبات حکیم الامت ۵۸۳)۔

راقم کہتا ہے کہ اصلاح کرنے والا پہلے منکرات کے ازالہ کی طرف توجہ کرتا ہے تاکہ عبادتوں اور اعمال کا ذخیرہ ''هَبَآءً منثورًا'' کی نذر نہ ہوجائے صرف اعمال کے ذخیرے کی

طرف توجہ نہیں کرتا۔

لہٰذا جب اصلاح کا پختہ ارادہ کرلیا جائے تو پہلے ان منکرات اور برائیوں کی تعیین کی جائے جن کو اپنے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً دوسروں کی تحقیر، بدنظری، حسد و کینہ، غیبت بل کہ چغلی، دوسروں کی وقعت گرانا حب جاہ حب مال وغیرہ وغیرہ۔

اب ان میں سے ایک ایک کو نکالنے کے لیے خوب مجاہدہ کریں اور نفس سے خوب جہاد کریں۔ بالقصد اپنی عظمت مٹائیں اور اللہ تعالی کی عظمت دل میں لائیں اس کا خوف دل میں لائیں اور آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی محبت کے واسطے سے آپ کی بیان کردہ سزاؤں اور وعیدوں کو یاد کریں اس کا یقین کریں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کریں۔

پہلی بار جب اصلاحی قدم اٹھائیں گے تو یقیناً آپ کو سو فیصد بوجھ پڑے گا آپ بالکل بآسانی قدم نہیں اٹھا سکیں گے لیکن ایک بار جب نفس کو ہمت سے پچھاڑ دیں گے تو دوسری بار اتنا بوجھ نہیں پڑے گا جتنا پہلی بار۔ پھر آپ نفس کو بچھاڑتے رہیے یہی ہے نفس اور رب کی معرفت "مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ بِالۡفَنَاءِ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالۡبَقَاءِ"۔ ترجمہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا جس نے اپنے نفس کے فانی ہونے کو سمجھ لیا اس نے اپنے رب کے باقی ہونے کو سمجھ لیا۔ نفس کی شناخت توفیق الٰہی سے ہوتی ہے اور رب کی شناخت نورِ معرفت اور باطنی صفائی سے ہوتی ہے (مفتاح العارفین ۸)۔

شہادت اور روزمرہ کے مجاہدات

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں ایک بار میرے دل میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ تو کیسا ذلیل ہے کہ فلاں جگہ جنگ ہو رہی ہے اور شہادت سے اپنے کو باز رکھ رہا

ہے، ویسے دینداری کی باتیں کرتا ہے، جا اور شہید ہو جا۔ کیا تجھے شہادت کا مرتبہ معلوم نہیں ، یا معلوم ہے اس کا یقین نہیں یا شہادت سے گھبراتا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں تردد میں تھا کہ کیا کروں؟ جب باریکی سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نفس کا فریب تھا وہ شہادت پر آمادہ اس لیے کر رہا تھا کہ وہ روز روز کے مجاہدوں سے گھبرا رہا تھا کہ یہ کیا قدم قدم پر گھستا اور پستا رہتا ہے، اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک دفعہ میں معاملہ تمام ہو جائے۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ نفس کی اس مکاری پر اگر سب ہی لوگ شہید ہو جائیں تو دین آگے کیسے پہنچے گا۔ معلوم ہوا کہ کبھی نفس کو مجاہدہ میں ڈالے رکھنا بھی شہادت سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ جیسے اس حدیث شریف ''مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهٗ اَجْرُ مِأَةِ شَهِيدٍ۔'' (مشکوۃ ۳۰) سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ کبھی روزمرہ کے مجاہدات کا درجہ (شہادت سے) زیادہ بلند ہوتا ہے کیوں کہ ہر وقت نفس سے مجاہدہ کرنا رہتا ہے اور وہ وقت امت کے بگاڑ کا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ تصوف نام ہے نفس پر ہر وقت خدا کے حکم کا آرا چلانے کا۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا ''اُقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِسَيْفِ الْمُجَاهَدَةِ'' (مفتاح العارفین ۴۰)۔

دور کرنے کے قابل ایک غلط فہمی

یہ بھی نفس کا ایک مکر ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ ازخود اصلاح نہیں کر سکتا اصلاح کے لیے بڑے پیر چاہیے یا تبلیغ کے چار ماہ چاہیے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفس اپنے اس مکر میں پھانس کر دوسرے مکر میں پھانسنے کی

کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی شیخ سے اصلاحی تعلق جوڑ لیا تو یہ خیال کر کے کہ اصلاح کے لیے تعلق ہی جوڑنا تھا جوڑ لیا بس اصلاح ہوگئی صرف دو چار عمل مثلاً تسبیحات ونوافل (نفلی اذکار وعبادات) اختیار کر کے بیٹھا رہے گا اور جو گناہ دور کرنے تھے ان سے بے فکر ہو کر رہ جائے گا۔

اب صرف شیخ کی خدمت میں آمد ورفت کی وجہ یہ بن جائے گی کہ لوگ مجھے دیکھتے رہیں کہ میں حضرت کا مرید ہوں۔ اب بتایئے اس میں اصلاح کیا ہوئی؟ اگرچہ اعمال اختیار کرنے کا ثواب حاصل ہو جائے گا لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے نفس، برائی کے کچھ اور دروازے کھول رہا ہے۔ اسی طرح تبلیغی چار ماہ کا مسئلہ [۱]۔

---

[۱] اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصلاحی تعلق نہ جوڑا جائے۔ یا تبلیغی کام نہ کیا جائے۔ استغفر اللہ۔ دونوں کام کیے جائیں۔ بندہ خود بھی پیر رکھتا ہے لیکن بے دینی عام ہونے کی وجہ سے تبلیغی جدوجہد سے زیادہ منسلک ہے۔ کیوں کہ عوام اس قدر بے طلب ہیں کہ ان کے پاس جا کر ترغیب نہ دی جائے تو فرائض تو درکنار ایمان وتوحید سے بھی بیزار ہو جائیں۔ اس کا انکار تو وہ کرے گا جو بدنصیب ہو۔

یہاں صرف اصلاح کی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ تعلق کا حقیقی مقصد اور چار ماہ خروج کا حقیقی مقصد ہر مرید ومبلغ کے سامنے رہے وہ صرف تعلق جوڑ کر اور دو چار عمل اختیار کر کے بیٹھا نہ رہے، بل کہ شیخ کی عدم موجودگی میں جو دل کے گناہ تھے جن کو نہ شیخ دیکھ سکتا ہے نہ تبلیغی ذمہ دار دیکھ سکتے ہیں اور نہ کبھی مریدین سے ان کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ان کو چھوڑے۔

مثلاً: اپنے بڑے ہونے کا خیال کرنا، دوسروں کی وقعت گرانا، اپنے کاموں میں غلو کرنا، خواہ مخواہ تکلفات برتنا، باطن کی فکر چھوڑ کر، صرف ظاہر کو سنوارنے میں لگے رہنا، خواہ مخواہ لوگوں سے بدظن ہونا، افواہ بازوں کا ساتھ دینا، غلط کاروں کا ساتھ دینا، وقت ضائع کرنا، غیبت کرنا، حسد کرنا اور بلا وجہ قہقہے لگاتے پھرنا وغیرہ وغیرہ۔

بندہ راقم الحروف مضمون بالا لکھ رہا تھا اس دوران حضرت حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جمع کردہ ملفوظات کی کتاب ''خطبات حکیم الامت'' پڑھ رہا تھا حسن اتفاق یہی مضمون سامنے آیا بے حد مسرت ہوئی جس کو مختصرًا پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الملت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اگر مسلمانوں میں کسی کو دین کا تھوڑا بہت خیال بھی ہوتا ہے تو وہ دین اسلام کی ساری اصلاح کا طریقہ صرف بیعت ہونے کو سمجھتا ہے کہ بس کسی سے مرید ہو جاؤ پھر خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔

بل کہ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ پیر ہم سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پس یہ لوگ اعمال کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ ہاں صرف پیروں کے نذرانہ کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ناغہ نہ ہو۔

صاحبو جو کام تمہارے کرنے کا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے لیے کچھ ہو سکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو طالب کا کام کرنے کے لیے کیوں کافی نہ ہوتے۔۔۔(۸۳،۵۸۱)۔

بندے کی بات حضرت رحمہ اللہ کی بات کے بالکل موافق ہے۔ فللہ الحمد۔

آسان ترین مطلوبہ اصلاح

آدمی کو چاہیے کہ وہ جہاں کہیں جس کسی سے بذریعہ وعظ و تقریر کچھ سنے یا کسی کتاب یا اوراق سے کچھ پڑھے تو فوراً اس سے جو کچھ اپنی اصلاح کی بات ملے قبول کر لے اور فورًا اپنی اصلاح کر لے۔ اس طرح سے اپنی اصلاح آسان بھی ہے اور مطلوب بھی۔ اصلاح کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً تنہائی میں فکر و تدبر سے کتاب پڑھنا، اصلاح و عبرت کی نیت سے وعظ سننا اور اسی نیت سے وعظ کرنا وغیرہ۔ حدیث شریف میں ہے ''اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْحَکِیْمِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا'' حکمت کی بات مؤمن کا گم شدہ سرمایہ ہے پس وہ اس کو جہاں بھی پائے اسے لے لینے کا

زیادہ حقدار ہے (مشکوۃ ۳۴۴)۔یعنی دین وآخرت میں فائدہ دینے والی ہر بات مومن کا مطلوب ہے لہٰذا مومن کو چاہیے کہ وہ جہاں سے حاصل ہو قبول کر لے۔

بعض عارفین سے بڑی عمدہ بات منقول ہے اللہ کرے ہمیں عبرت دے جائے۔انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے کوئی بات حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے جلیل القدر بزرگ سے سنی لہٰذا اس کو قبول کرلیا لیکن اسی بات کو اس نے اپنی کنیز اور باندی کی زبان سے سنی تو اس کو قبول نہیں کیا تو سمجھ وہ شخص متکبر ہے (مظاہر حق ۲۷۴/۱)۔

بل کہ یہ راقم آثم کہتا ہے کہ اگر آدمی کی نیت اصلاح کی ہوتی ہے اور فکر بھی تو وہ صرف دینی فضا وماحول سے ہی نہیں بل کہ لوگوں کے دنیوی روزمرہ کے معاملات سے بھی ان کو سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر اپنی اصلاح کا مواد پکڑ لیتا اور اس پر نشان دے لیتا ہے کہ ہاں یہ بات ہے جو میری اصلاح کی ہے۔اس کی مثالیں اول الواجبات میں ملاحظہ ہوں۔

لہٰذا اس طرح آپ جتنی اصلاح از خود کر سکتے ہیں وہ کریں پھر آپ کسی سے بیعت ہوں۔ جب آپ اس طرح صاف دھلے کپڑے کی طرح پاک صاف ہوکر اصلاح کے لیے کہیں جائیں گے تو آپ کے مربی آپ کو بہت بلند مرتبے پر لیجائیں گے اور کم محنت اور کم مدت میں آپ طویل مسافت طے کرلیں گے۔

ساتھ ساتھ آپ دعوتی جدوجہد کے تقاضوں پر چار ماہ بھی اس طرح خروج کریں کہ جان بھی اپنی اور مال بھی اپنا۔ اس سے زندگی کے بے شمار گوشوں کی بڑی اصلاح ہوگی مثلا: امیر کی اطاعت، مسجد کی چہار دیواری، اتباع سنت، تصحیح یقین، تخلیص نیت، ضروری مسائل وفضائل کا علم، ذکر واستحضار، دوسروں کی فکر اور اپنی جان اپنا مال دین پر صرف کرنا وغیرہ وغیرہ۔ آپ اگر اپنی اصلاح کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو ذریعہ ہدایت اور گمراہی کا تالا بنائیں گے۔اور نبیوں والی فکر، نبیوں والا درد اور نبیوں والی ہدایت وبرکت عطا فرمائیں گے۔

اپنی اصلاح کرلینا کافی نہیں نجات کے لیے اور بھی

مفسرِ قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی کا صرف اپنی ذات کی اصلاح کرلینا نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ بل کہ نجات کے لیے دوسری بھی ذمہ داریاں شریعت نے عائد کی ہیں۔

چناں چہ انہوں نے سورۃ العصر کے تحت دیگر مفسرین کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس سورۃ شریفہ میں تمام انسانوں کی ناکامی اور خسارہ کی قسم کھائی ہے۔ سوا ان سعادت مندوں کے جن میں چار اوصاف ہوں۔

(۱) ایمان والا ہو۔

(۲) عمل صالح اختیار کرنے والا ہو۔

(۳) دوسروں کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت و تاکید کرنے والا ہو۔

(۴) خود سے صبر و تحمل پر قائم رہ کر دوسروں کو بھی صبر و تحمل کی تاکید کرنے والا ہو۔

پہلے کے دو اوصاف اس لیے دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ آدمی خود کامل بنے۔
اور آخر کے دو اوصاف اس لیے دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ دوسروں کو کامل بنائے۔

تواصی کہتے ہیں۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنا اور نیک کام کی ہدایت کرنا۔ یہ وصیت ایک تو ہے حق کی اور دوسری ہے صبر کی۔ حق سے مراد عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور برائیوں سے بچنا ہے۔ ان دونوں کی نصیحت دوسروں کو کرنا ہے۔

دوسروں کو جب حق و صبر کی دعوت دے گا تو اس میں احتمال ہے کہ وہ اس کو نہ مانے بل کہ ممکن ہے کہ اس سے لڑنے جھگڑنے لگے اور تکلیف پہنچائے تو اس مصیبت پر خندہ پیشانی سے

صبر کرے۔ اگرچہ اس صبر کی تاکید دوسروں کو کرنا ہے لیکن پہلے خود اس پر کاربند ہونا ہے تاکہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرنا مؤثر ہو۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سورۃ شریفہ نے مسلمانوں کو بڑی اہم ہدایت دی ہے وہ یہ کہ ان کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کرلینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم اور ضروری دوسروں کو ایمان واعمال کی طرف بلانا اور مقدور بھر اس کی کوشش کرنا ہے۔ ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہیں۔ خصوصًا اپنے اہل وعیال اور متعلقین کے اعمال سیئہ میں غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی قدرت کے بقدر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' فرض کیا گیا ہے لیکن اس میں عام مسلمان تو کیا بہت سے خواص بھی غفلت کے شکار ہیں (معارف القرآن ۸/ ۸۱۳)۔

حضرت مولانا عبیداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہیں ہوتے تھے جب تک وہ ایک دوسرے کے سامنے اس سورہ کو نہ پڑھ لیتے۔ اور محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سورہ کے علاوہ کوئی اور سورہ نازل نہ بھی فرماتے تو یہ کافی ہوجاتی، لوگ اگر اسی سورہ کو غور وتدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو دین ودنیا کی درستگی کے لیے کافی ہوجائے (معارف القرآن ۸۱۱/۸)۔

مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ دوسروں کو ایمان واعمال کی دعوت دینا صرف حضرات علماء وائمہ ہی کا کام اور ان ہی کی صرف ذمہ داری نہیں بل کہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ تو علماء وائمہ کی کتنی ذمہ داری ہوئی۔!! لہٰذا ائمہ حضرات خود کی ذمے داری سمجھتے ہوئے اپنے ماتحت مقتدیوں کو اس اہم ذمہ داری سے مطلع کریں اور ان کو یہ بتادیں کہ نجات کے لیے صرف اپنے اعمال کرلینا کافی نہیں بل کہ دوسروں کے دین وایمان کی فکر بھی ضروری ہے۔ اس طرح سے ان کو

دین کا داعی بنائیں اور ان میں جذبۂ حق ودعوت پیدا کریں۔

حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کی فکر

حضرت موسیٰ بن مغیرہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ عین دوپہر کے وقت حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کو بازار جاتے دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ وہ بازار میں بآواز بلند ''اللہ اکبر''، ''سبحان اللہ'' وغیرہ کلمات کہہ رہے ہیں۔ کسی نے ان سے پوچھا آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں تو فرمایا کہ لوگ بازاروں میں اللہ تعالیٰ سے اور آخرت کے خسارہ سے بہت غافل ہوتے ہیں میں ان کلمات کے ذریعہ ان کو اس سے بچانا چاہتا ہوں (کتاب الزہد ر ۳۱۲)۔

دیکھا ہمارے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ اپنے ماتحتوں کی اصلاح کی کیسی فکر فرمایا کرتے تھے؟ یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب کہ خیر شر پر غالب تھا پھر بھی انہوں نے بازاروں میں اصلاح کی ضرورت سمجھی۔ آج شر کتنا غالب ہے، بازاروں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ کوئی ہے آج جو بازاروں میں اس طرح اللہ اور آخرت کی یاد دلائے اس کا جواب نفی ہی میں دیا جاسکتا ہے۔

ہاں صرف ایک جماعت ہے اور وہ ہے تبلیغی جماعت۔ اللہ تعالیٰ تبلیغ ودعوت کی محنت کرنے والوں کو جزاء خیر دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور آخرت کی یاد دلانے کی محنت بازاروں میں بھی کرتے ہیں بل کہ گناہوں کے اڈوں پر بھی جا کر ان کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو اور محنت کرنے والوں کو آباد رکھیں آمین۔

شیطان کی سوچ اور اس کی مانگ

ہر کوئی اللہ تعالیٰ سے اپنے طور پر خیر وبھلائی مانگتا ہے۔ کوئی مال ودولت کوئی حکومت

واقتدار مانگتا ہے،کوئی قوت وصحت ،اولاد اور بیوی مانگتا ہے۔لیکن غور کیجئے شیطان نے مانگا تو کیا مانگا اوراس نے سوچا تو کیا سوچا۔ جب اس سے خدا کی نافرمانی ہوئی تو اسے معافی مانگ لینی چاہیے تھی لیکن اس لعین وخبیث کی سوچ گندی تھی ،تواس کی دعا بھی بُری تھی اس نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تو یوں مانگا۔

اے مرے رب مجھے مہلت دے قوت دے بعثت کے دن تک تا کہ میں تیرے بندوں کو بھٹکا سکوں ''قَالَ رَبِّ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ○'' تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دیدی '' قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ○قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ○''مطلب شیطان اکیلا جہنم میں نہیں جائے گا وہ اپنے ساتھ سب کو لے کر جائے گا۔لہٰذا اس کے بالمقابل انبیاء واولیاء اور علماء علیہم السلام تنہا جنت میں نہیں جائیں گے بل کہ وہ اپنے ساتھ۔ان شاء اللہ۔ دوسروں کو بھی لے کر جائیں گے۔اس لیے ہمیں بھی نبیوں کی طرح سارے انسانوں کی اوران کی جنت کی فکر کرنی چاہیے۔

کتنے مقتدی ہیں، جو بالخصوص فجر کی جماعت میں حاضر ہوتے ہیں ! کیا نمازی مقتدی بھی رات کو سوتے وقت ان کو فجر کی نماز کی دعوت دے کر سوتے ہیں؟ یا فجر میں ان کے گھروں سے گزرتے ہوئے بھی دعوت دیتے گزرتے ہیں؟ یا کم ازکم ان کے گھروں سے گزرتے ہوئے دعوت دینے کا خیال اور دعاء بھی کرلیتے ہیں کہ اے اللہ ان گھروں کے مسلمانوں کو نمازی بنادے اور ان کو نماز کے قضاء کے گناہ سے بچادے۔ مذکورہ سورۃ میں اسی کو تو سمجھایا کہ ہم دوسروں کو حق وصبر کی تاکید کریں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

خیر وبھلائی پر لانے میں کبھی اِکراہ جائز بل کہ مستحب ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

اس شخص پر رحم فرمائیں جو رات کو نماز تہجد کے لیے اٹھے اور اپنی بیوی کو جگائے، تا کہ وہ بھی نماز تہجد پڑھے، اور اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کی چھینٹ دے۔

اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائیں جو رات کو نماز تہجد کے لیے جاگے اور اپنے شوہر کو جگائے تا کہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی کی چھینٹ دے (مشکوٰۃ/۱۰۹)۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں اگرچہ پہلے جملہ میں ذکر صرف بیوی کا ہے کہ اسکو جگائے لیکن اس میں اپنے ماتحت تمام محارم بھی شامل ہیں کہ ان سب کو نماز کے لیے اٹھانا چاہیے۔ مثلاً بیٹی، بہن، والدہ، اسی طرح بیٹا، بھائی اور والد وغیرہ۔ لیکن شفقت ونرمی سے اٹھائے اس طرح نہ اٹھائے کہ وہ متنفر ہو جائیں۔

اور نہ اٹھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ سستی یا غلبۂ نیند کی وجہ سے نہ اٹھ سکیں، تو ان کو مذکورہ طریقہ سے اٹھائے تا کہ نیند کا غلبہ دور ہو۔ اور پھر لکھا ہے کہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی کبھی خیر کے کاموں پر لانے کے لیے ان پر اکراہ وجبر کرنا جائز ہے بل کہ مستحب ہے۔ [۱] (مرقات ۳/۱۴۹)۔

حدیث شریف سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوا کہ لوگوں کو نماز تہجد کے علاوہ دوسرے خیر وبھلائی کے کاموں پر بھی پیار بھرے جبر ودباؤ سے لانا چاہیے، چاہے وہ کام فرائض وواجبات ہوں کہ نفل و سنت بل کہ نفل وسنت سے زیادہ فرض وواجب پر لانے کی سعی کرنی چاہیے، کیوں کہ فرائض وواجبات کا

---

[۱] جیسے اوپر لکھا ہے کہ اس طرح نہ اٹھائے کہ وہ متنفر ہو جائے۔ جس کی آسان صورت یہ ہے کہ اٹھانے سے چند دن پہلے تعلیم کتاب کے ذریعہ فضائل تہجد سنائے اور مجاہدہ کے فضائل سمجھائے پھر ان کو اٹھنے پر آمادہ کرے اور ان سے ہی پوچھ لے کہ کیا آپ تیار ہیں۔ اس طرح ان کی آمادگی کی محنت کر کے پھر وہ ترکیب آزمائے جو مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس عظیم دولت وسعادت سے نوازیں۔

درجہ مقدم ہے۔یہی بات سمجھانے کے لیے یہ عنوان قائم کیا ہے۔لہٰذا ائمہ حضرات منکرات کو مٹانے کے لیےاور معروفات کو زندہ کرنے کے لیےلوگوں کو سمجھائیں اور حکمت سے کام لیں اور اپنے منصب کی قوت وزور کو کام میں لائیں۔

ائمہ میں دینی ماحول بنانے کی خوبی

حضرت مولانا آزاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر فرمایا کہ لوگ ماحول کا رونا روتے ہیں کہ آج کل ماحول ہی ٹھیک نہیں، فرمایا ماحول تو آدمی خود بناتا ہے (اسی لیے تو ماحول یعنی اردگرد کہتے ہیں)، آدمی جب خود ٹھیک ہوگا تو اس کا اردگرد خود ہی ٹھیک ہو ہی جائے گا۔اسی لیے تو لوگ کہا کرتے ہیں ’’ہم اچھے تو سب اچھے‘‘۔

جب سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تشریف لے گئے تو وہاں کونسا ماحول تھا! ماحول تو خود انہوں نے جا کر بنایا۔انہوں نے سب سے پہلے توحید کی دعوت دی ’’یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ۔۔۔‘‘،تقویٰ،خوش اخلاقی،صبر وشکر کی ترغیب دی اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری کر کے دینی ایک ماحول قائم کیا،ایسا ماحول کہ ان کے نکلنے پر قیدی رو رہا ہے اور افسوس کر رہا ہے کہ آپ آئے تو قید خانہ مدرسہ بن گیا،باغ بن گیا بل کہ رشک جہاں بن گیا،آپ جا رہے ہیں معلوم نہیں ہمارا کیا ہوگا؟۔

اس سے بڑھ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو ماحول ملا وہ عالم گیر جہالت کا اسی لیے تو اسے زمانہ جاہلیت کہتے ہیں۔مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ماحول کا کیسا رخ پھیر دیا کہ سب سے زیادہ جاہل سب سے زیادہ جاننے والے،گمراہ اور بھٹکے لوگ دوسروں کے لیے چراغ ہدایت بن گئے اور ایسا خوش گوار ماحول قائم کیا کہ اس کی مثال نہ اس سے پہلے پائی گئی نہ اس کے بعد۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ کرام کو انبیاء علیہم السلام کی اس صفت سے متصف ہونا چاہیے کہ جہاں جائیں جہاں بیٹھیں صالح ماحول قائم کریں بل کہ مقتدیوں کو بھی اس کی ترغیب دیں کہ وہ بھی صالح ماحول بنانے میں آپ کا ہاتھ بٹائیں۔

مقتدیوں کے گنہگار اور برے ہونے سے آپ نفرت نہ کریں بل کہ پیار سے ان کو سمجھائیں کہ ہم چاہے لاکھ گندے لاکھ گنہگار، مانا کہ گناہ نہیں چھوٹتے گناہ کی عادت ہوگئ تو کم از کم گناہ کم تو کر دیں، بار بار توبہ تو کریں۔ اگر بایزید بسطامیؒ، خواجہ **معین الدین چشتی**ؒ نہیں بن سکتے تو شیطان بھی تو نہ بنیں، گناہوں سے معافی تو مانگا کریں شیطان معافی نہیں مانگتا تم تو مانگ لیا کرو۔ ائمہ حضرات ان چیزوں پر دھیان دے کر پاکیزہ معاشرہ قائم کریں۔ نیز ائمہ حضرات لوگوں کو ذمہ داریوں کا احساس بھی دلائیں۔

ائمہ میں دینی احساس دلانے کی خوبی

تمام انبیاء علیہم السلام نے سب سے اہم تین باتوں کو سمجھایا توحید، نبوت اور حیات آخرت۔ اور ان تینوں میں بھی اہم حیات آخرت ہے۔ کیوں کہ جو اس کو مانے گا وہ توحید و نبوت کو ضرور مانے گا۔ اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام نے اس کو بہت تاکید سے سمجھایا کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور عالم ہر لمحہ عدم کی طرف رواں دواں ہے، اور انسانی جو قدم بھی اٹھتا ہے وہ قدم عدم کی طرف اٹھتا ہے۔ اسی لیے روایت میں اس زندگی کو سفر سے سمجھایا ہے

فانی ہر ایک شئ یہاں لاکلام ہے	کہتے ہیں جس کو باقی وہ اللہ کا نام ہے

ائمہ کرام مقتدیوں میں حیات آخرت کا خوب احساس پیدا کریں۔ اور ان کو اس کی تاکید کریں کہ وہ خود بھی دوسروں میں اس احساس کو بیدار کریں۔ کیوں کہ آدمی خود اچھے احساس

پر اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اس کے ارد گرد بھی اسی احساس کا ماحول ہو۔کوئی عابد و عالم، متقی وزاہد، داعی و مصلح ، قاری وحافظ اور دیندار اپنے وصف خاص میں کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک آخرت کو یاد نہ رکھے اور قبر کی زندگی کو یاد نہ رکھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو علماء کے مجمع کو بلاتے جو موت کا قیامت کا اور آخرت کا ذکر کرتے اور ایسا روتے جیسا کہ جنازہ سامنے رکھا ہو۔

اصلاح میں ائمہ بڑوں کا اکرام فراموش نہ کریں

جب کوئی آدمی اصلاح کا کوئی کام لے کر اٹھے تو اسے اپنی اس تبلیغ واصلاح میں بڑے حضرات سے بھی سابقہ پڑے گا اور ان کو تعلیم وآداب سکھانے کی ضرورت پیش آئے گی،ان کے بڑے ہونے سے اصلاح کا فریضہ ساقط نہیں ہوگا۔لیکن ہاں ان کے علومرتبہ کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمُ قَومٍ فَاَکْرِمُوْہ" (ابن ماجہ باب ۱۹ /۲)۔ جب تمہارے پاس کسی قوم وجماعت کا کوئی معزز شخص آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔نیز حدیث میں ہے "وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا" کہ جو ہمارے بڑوں کا اکرام نہ کرے وہ ہمارے (اس اکرام کے) طریقہ پر نہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو آپ کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمائش کی کیوں کہ وہ مدینہ المنورہ میں گورنر تھے تو اس مقام کا لحاظ کرتے ہوئے نماز جنازہ ان سے پڑھوائی تا کہ ان کے اکرام کا ادب حاصل ہو۔(اشبہ الناس بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الحسن بن علی ۲ /۲۲۸)۔

جب اپنے سے بڑوں کو کوئی تعلیم دینی ہو ان کی کچھ اصلاح کرنی ہو تو کس طرح کریں

کہ ان کا ادب بھی ملحوظ رہے اور اصلاح بھی ہو جائے۔ اس کی ایک مثال ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ کردی رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقدس نواسے حضرات حَسَنین (حسن وحسین) رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ دریائے فرات کے کنارے ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی وضو کیا اور اس طرح جلد بازی میں نماز بھی پڑھی جس میں مسنون طریقہ کی کوئی رعایت نہیں کی حضرات حسنینؓ اسے سمجھانا چاہتے تھے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ شخص عمر رسیدہ ہے کہیں اپنی غلطی سن کر بھڑک نہ جائے،

دونوں حضرات اس کے قریب پہنچے اور کہا کہ ''ہم دونوں جوان ہیں اور آپ تجربہ کار آدمی ہیں آپ وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو وضو کر کے اور نماز پڑھ کر کے دکھائیں تا کہ ہماری کوئی غلطی ہو تو آپ ہمیں بتا دیں۔ انہوں نے اس کے بعد سنت کے مطابق وضو کر کے سنت کے مطابق نماز پڑھ کر دکھائی۔ جب بوڑھے شخص نے سنتوں کی رعایت والا وضو اور نماز دیکھی تو سمجھ گیا کہ اصل میں ان کی اصلاح مقصود نہیں بل کہ میری اصلاح مقصود ہے لیکن انہوں نے ادب کے خاطر یہ طرز اختیار کیا ہے تو اس بوڑھے نے اعتراف غلطی کے ساتھ اپنی غلطی اور کوتاہی سے توبہ کی اور سنت طریقہ اختیار کیا،، (مناقب الامام الاعظم للکردی ۱ر۳۹)۔

(۸) ائمہ حضرات شرعاً داعی اور مبلغ ہوتے ہیں

دعوت اسلام کی روح اور اس کی وہ بنیاد ہے کہ جس پر اسلام کا بقا منحصر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس خاص الخاص کام کے لیے رسول بنا کر مبعوث فرمائے گئے وہ دعوت الی اللہ ہے، دعوت آپ کا سب سے بڑا مشن ہے۔ حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ دعوت الی اللہ نبوت کی شاخ ہے۔ اسی لیے تو تعلیم پر مشتمل سب سے

پہلے وحی نازل ہوئی تو ساتھ ہی دوسری وحی دعوت پر مشتمل ’’قُمۡ فَاَنۡذِرۡ‘‘ نازل ہوئی کہ جتنا علم حاصل ہوا اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

اسی لیے دعوت اور داعی کی تعریف کی گئی ہے۔ ارشاد ہے’’ وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلاً مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا ‘‘(بنی اسرائیل)۔ علماء اسلام نے لکھا ہے کہ دعوت اور عمل دونوں کو اکٹھا جمع کرنا دین کو سب سے اچھا بنا دیتا ہے۔ اسلام میں حسن لانے کا راستہ دعوت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ اس سے اچھا اسلام کسی کا ہو ہی نہیں سکتا جو دعوت دیتے ہوئے عمل کرے۔ دعوت امت کا ایک اجتماعی فریضہ ہے (مسجد کی آبادی کی محنت ۷)۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ امامت کے ساتھ ساتھ خصوصی توجہ تبلیغ دین اور احیاء دین پر فرمائیں۔ یقیناً ہمارا تعلیم وامامت کا انجام دینا قابل مبارک باد عمل ہے تاہم اس کے ساتھ تبلیغ کو انجام دینا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ ائمہ شرعاً معلّم ہونے کے ساتھ داعی اور مبلغ بھی ہوتے ہیں۔ آپ یقیناً تعلیم کے فریضہ کو انجام دے رہے ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھیں کہ آپ مبلغ بھی ہیں کیوں کہ تعلیم وتبلیغ میں باریک فرق ہے حقیقی اور کامل مبلغ اور ہوتا ہے۔ **حضرت مولانا عبیداللہ صاحب** بلیاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **حضرت مولانا محمد الیاس صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ نے عجیب باریک فرق بتایا وہ یہ ہے کہ غیر طالب کو دین سکھانا تبلیغ ہے اور جب وہ طالب ہوجائے تو اس کو دین سکھانا یہ تعلیم ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی مبلغ ہے تو وہ معلم بھی ہے (مواعظ عبیدیہ ۳۰۷)۔

دعوت ایک ایسی عظیم الشان صفت ہے جس کی نسبت نہ صرف امت کی طرف ہے بل کہ امت کے نبی کی طرف بھی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کر کے اس کی اہمیت کو جتلایا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

(۱) " وَاللهُ يَدْعُوْ إِلَى دَارِ السَّلَامِ " (یونس ۲۵) کہ اللہ جل شانہ (لوگوں کو) دارالسلام (جنت) کی طرف بلاتے ہیں۔

(۲)" يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ، وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيْرًا " (احزاب ۴۵،۴۶)۔اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کوشاہداور بشارت دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔اورآپ اللہ تعالی کے حکم سے (لوگوں کو) اللہ تعالی کی طرف بلانے والے اورروشن چراغ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

(۳) " وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " (ال عمران ۱۰۴) اورتم میں کی ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی طرف دعوت دے اور وہ لوگ (دوسروں کو) بھلائی کا حکم کریں اور برائیوں سے روکیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

بل کہ دعوت خود انسانی فطرت ہے آپ کہیں گے یہ کیسے !اس کواس طرح سمجھیے کہ جو کوئی خوشی کی بات ہوتی ہے آدمی اس خوشی میں دوسروں کو بھی شامل کرنا چاہتا اور اس کو ان میں بانٹنا چاہتا ہے اوراس کا اظہار دوسروں کے سامنے کرنا چاہتا ہے۔ایک بچہ محلہ میں کھیلتا ہے جب وہ اپنے باپ کوسفر سے گھر آتے دیکھ لیتا ہے تو دوڑ کر اپنی امی جان کے پاس جا کر خبر دیتا ہے کہ ابا جان آگئے، طالب علم پڑھائی میں کامیابی کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کرتا اور سب ہی کوخوشی میں شامل کرتا ہے۔

آدمی چلتے ہوئے سانپ دیکھ لیتا ہے تو جتنا اہتمام اپنے بچاؤ میں کرتا ہے اتنا ہی اہتمام دوسروں کے بچانے میں بھی کرتا ہے فوراً از ور زور سے چلاتا ہے سانپ سانپ مطلب کہ ہر قسم کے نقصان سے دوسروں کو بچانے کا جذبہ فطری طور پر ہر شخص میں ہے۔انہی فطری دو

وصف (خوشی میں شامل کرنے ضرر سے بچانے) کا اعلان ''مبشرًا ونذیرًا'' سے کیا گیا ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابدی بشارت دینے اور ابدی مضرتوں سے ڈرانے والے ہیں۔

جس طرح ظاہری تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک تو چراغ ہوتا ہے اور دوسرا اس سے بڑھ کر آفتاب ومہتاب ہوتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ دعوت وتبلیغ باطنی تاریکی کو مٹانے کے لیے مبعوث فرمایا تو فرمایا آپ روشن چراغ ''سِرَاجًا مُنِیْرًا'' ہیں۔ چاند وسورج نہیں فرمایا، حالاں کہ عقلی تقاضا یہ تھا کہ چاند کہا جاتا سورج کہا جاتا جو کہ روشنی میں بے مثال ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ عقلی تقاضے کے مطابق اگر سورج وچاند کہا جاتا تو وہ مقصد حاصل نہ ہوتا جو سراج منیر کہنے میں ملحوظ ہے۔ وہ یہ کہ تاریکی کو دور کرنے کے لیے اولاً ایک شخص چراغ روشن کرتا ہے پھر اس سے دوسرا شخص اپنا چراغ روشن کرتا ہے پھر اس سے تیسرا شخص اس طرح آن کی آن میں ہزاروں چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور تاریکی کو مٹایا جاتا ہے۔ لہٰذا بذریعہ دعوت وتبلیغ دوسروں کو روشن کرنے کے لیے جامع کلمہ یہی تھا کہ ''سراج منیر'' کہا جائے اور باطنی تاریکی کو مٹایا جائے۔ برخلاف سورج وچاند کے کہ وہ ایک ہی ہیں، ایک سورج سے دوسرا سورج اور ایک چاند سے دوسرا چاند وجود میں نہیں آسکتا۔

''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امت سے مراد مجاہدین اور علماء ہیں جن کا فرض منصبی دعوت الی اللہ ہے۔ اور لکھا ہے کہ آیت شریفہ کا مقصود یہ ہے کہ اس امت کا ایک طبقہ تو بطور خاص اسی کام کے لیے مخصوص ہو۔ اگرچہ یہ عظیم الشان کام ویسے تو اپنے بس کے بقدر امت کے ہر فرد پر واجب ہے۔ پھر دعوت کی اہمیت پر بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔

ایک حدیث شریف کا خلاصہ ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس

کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیجے گا پھر تم اس سے دعا بھی کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی (تفسیر ابن کثیر ۲/۳۹۰ والترمذی)۔

ان مذکورہ نصوص سے جہاں دعوت کی خوب اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی داعی ہیں، نبی بھی داعی اور امت بھی داعی۔ اور علماء وائمہ تو دوہرے درجہ میں داعی ہیں۔ انبیاء کے وارث ہوکر اور امت میں شامل ہوکر۔ لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ وہ منصب امامت سے دعوت الی اللہ کا کام خوب انجام دیں، بل کہ آیت شریفہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ انہیں اپنے ماتحت مقتدیوں کا مزاج بھی دعوتی بنانا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعوت کا اندازہ ذیل کی روایت سے کیجئے۔ حیاۃ الصحابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس دن کا ذکر ہے جس میں وہ مشرف باسلام ہوئے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آپ کو دعوت دی تو اسلام قبول کرلیا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد خوش ہوئے۔

حضرت ابوبکرؓ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ بن عفان، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن وقاصؓ کے پاس تشریف لے گئے، ان کو دعوت دی یہ حضرات بھی مسلمان ہوگئے تو دوسرے روز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، ابوعبیدہؓ، عبدالرحمنؓ، ابوسلمہؓ اور ارقمؓ کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے وہ لوگ بھی مشرف باسلام ہوئے (حیاۃ الصحابہ مترجم ۱/۸۰)۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی وہ فکر لاحق تھی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھی۔

وجہ یہ ہے کہ باطل اور ضلالت کا توڑ صرف دعوت ہے کہ دنیا کا باطل ٹوٹے گا تو صرف دعوت سے اور دنیا کی تاریکی اگر ختم ہوگی تو نبی والی دعوت سے، نبی کو دعوت لے کر اسی لیے

مبعوث فرمایا ہے تاکہ باطل مٹ جائے جوصرف اعمال اختیار کرلینے سے حاصل نہ ہوگا۔

لہٰذاائمہ حضرات کو بقول **حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ علیہ تعالیٰ بل کہ بقول **حکیم الامت علامہ تھانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ائمہ کو دعوت لے کر اپنے اطراف وجوانب (دیہات اور قریبی علاقوں) میں جانا پڑے تو ضرور جائیں، اپنی امامت وتعلیم میں کسی کو نائب بنانا پڑے تو بنالیں لیکن جائیں ضرور۔اس کو خدا کی بڑی نعمت وسعادت سمجھیں۔

حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ مدرسہ سے عام تبلیغ کا بھی انتظام ہونا چاہیےاس کے لیے ضرورت پڑے تو تنخواہ دار مبلغ بھی رکھے جائیں اور ان کو اطراف وجوانب میں بھیجا جائے اوران کواس کی تاکید بھی کی جائے کہ وہ لوگوں سے مدرسہ کے لیے چندہ طلب نہ کریں۔وہ صرف احکام پہونچائیں۔اورفرماتے تھے کہ لوگ اگر مدرسہ کے لیے سامنے سے چندہ دیں تو اسے بھی قبول نہ کریں۔ہاں مدرسہ کا پتہ دیدیں اورخود مبلغ کو بھی کوئی ہدیہ دے تو اسے بھی قبول نہ کرے اس کا کام صرف احکام کی دعوت وتبلیغ ہو اسی بےغرض وعظ وتبلیغ کا بڑا فائدہ ہوگا اورمخاطب پر بڑا اثر پڑے گا (العلم والعلماء۱۰۶)۔

دعوت وتبلیغ کا فقہی حکم [۱]

(۱) تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے اصولاً۔(یعنی عقائد کی) بھی اورفروعاً (یعنی مسائل کی) بھی۔اس کا فرض ہونا تو اس سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح کا امر فرمایا ہے اسی طرح تواصی بالحق (یعنی وصیت کرنے) کا بھی حکم فرمایا ہے اوراس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کوموقوف کیا ہے۔

---

[۱] (ماخوذ از کتاب تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے ۳۵۷ تا ۳۷۱)۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں " وَالْعَصْرِ () إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ () إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ () "۔

حق تعالیٰ اس جگہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان خسارہ میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے۔ اور باہم ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا۔ دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا (حضرت تھانوی صاحب رحمہ اللہ علیہ التواصی بالحق ص ۱۵۵۔۱۵۶)

پھر قادر کے ذمہ تو یہ وجوب علی الکفایہ ہے اگر اتنے آدمی اس کام کو کرتے ہوں کہ بقدر حاجت کام چل رہا ہو، تو دوسرے اہل قدرت کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا (بیان القرآن ص ۴۵)

ایک موقع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ تبلیغ ہم پر فرض ہے اس کے بغیر ایمان کامل حاصل نہیں ہوسکتا (خطبات حکیم الامت)۔

(۲) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا: کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کے ذمہ فرض عین ہے۔۔۔مگر آج ہم اس کی فرضیت سے غافل ہیں۔ (اصلاحی خطبات ج۹)۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم : تبلیغ فرض عین ہے ۔مختلف جہتوں سے تبلیغ ودعوت کا کام خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بالخصوص اس دور میں جب کہ شر کی قوتیں اپنی مفاسد پھیلا رہی ہیں۔

اور ماشاء اللہ تبلیغی جماعت بحیثیت مجموعی اسی کام کو بطریق احسن پورا کر رہی ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

واللہ سبحانہ اعلم — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۲۔۸۔۱۹ سنہ ۱۴۱۹ھ — ماہنامہ ''البلاغ''

(۴) **حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی** صاحب دامت برکاتہم: خاص صورتوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے اور تمام حالات میں نیکیوں کی ترغیب اور برائیوں سے روکنے کی مقدور بھر کوشش کرنا اس امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے اور مروجہ تبلیغی جماعت اس اہم دینی ذمہ داری کو بڑی جانفشانی سے مؤثر طور پر انجام دے رہی ہے۔

لہٰذا اس کام میں ان کے ساتھ لگنا اور تعاون کرنا بہت بڑی سعادت اور باعث اجر وثواب ہے۔

واللہ المستعان وھو اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ

۴۔۱۳۔ سنہ ۱۴۱۶ھ

ماہنامہ ''البلاغ''

(۵) **حضرت مولانا طارق جمیل** صاحب: نے فرمایا اگر امت نے فرائض چھوڑ دیئے ہوں تو تبلیغ کرنا فرض ہے۔۔۔اور اگر واجب چھوڑ دیئے ہوں تو تبلیغ واجب ہے۔۔۔اگر سنت چھوڑ دی ہو تو تبلیغ کرنا سنت ہے۔اب ہم خود اندازہ لگالیں کہ امت کیا کیا چھوڑ رہی ہے۔

میرے دوستو! آج بھی اس دنیا میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جنہیں یہ پتہ نہیں کہ دین اسلام بھی کوئی دین ہے، قرآن بھی کوئی کتاب ہے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کوئی رسول ہیں۔اس کی

وجہ کیا ہے کہ ہر دور میں نئی نسل آ رہی ہے۔۔۔اس وقت کتنے ارب انسان حالت کفر میں زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔اگر یہ اسلام نہ لائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں چلے جائیں گے۔

آج شیطان نے بڑے عجیب چکر میں ڈال رکھا ہے۔دین دار طبقہ کو یہ چکر دے رکھا ہے کہ تم اپنی نماز پڑھتے رہو۔اور جاہل طبقہ کے دل میں یہ ڈال دیا ہے کہ تم (بس) کس منہ سے لوگوں کے پاس جاؤ گے۔

(٦) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول : (اللہ ہم پر رحم فرمائے) نہ ہم ایک دوسرے کو نیکی کی دعوت دیتے ہیں نہ برائی سے روکتے ہیں۔۔۔اللہ ہم کو معاف نہیں کرے گا۔۔۔نہ معلوم ہم پر کون سا عذاب آئے (احیاء العلوم)

(۷) فتاوی عالمگیری : لکھا ہے کہ اگر مخاطب کے بات کو سن لینے کی امید ہو تو تبلیغ واجب ہے۔

(۸) **حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول :** مولوی فاروق صاحب نے فرمایا کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ اے فاروق تو میرے کہنے پر تبلیغ پر نکل جا۔۔۔ چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر حضرت مولانا فاروق صاحب نے یہ بھی فرمایا حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس راستہ میں نکلنا قبولیت کی علامت ہے۔اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سب طالب علموں کو اللہ کے راستے میں نکالتا (حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مدظلہ)۔

(۹) **حضرت مولانا زکریا صاحب** رحمۃ اللہ علیہ: نے شمائل ترمذی میں ۱۸ گناہ کبیرہ لکھے ہیں۔۔۔اس میں سے ایک گناہ کبیرہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کرنا بھی لکھا ہے۔

(۱۰) **حضرت مولانا شمس الحق افغانی** رحمہ اللہ تعالیٰ : جو شخص دعوت الی اللہ کا کام کرے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ شخص دنیا سے بغیر ایمان کے چلا جائے۔۔۔کہ ساری زندگی تو اللہ

تعالیٰ کی طرف بلا تار ہا اور اب اللہ تعالیٰ اس کو ایمان سے محروم کر دیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

(ماخوذ از کتاب تبلیغ بالیقین کارنبوت ہے ۳۵۷ تا ۳۷۱)۔

سیرۃ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا مشن تھا، آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک ایک امتی کا درد تھا، آپ ہمیشہ دعوت کے لیے متفکر رہا کرتے تھے حتی کہ خود اللہ جل شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی ہے "فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا" (الکھف ۶) آپ اس انتظار میں نہیں رہا کرتے تھے کہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو ان کو دعوت دیں بل کہ آپ بنفس نفیس اور آپ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کے گھروں بازاروں اور میلوں میں جا کر انہیں حق کی دعوت دیتے تھے۔

مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو وہاں بھی آپ دعوت کو فراموش نہ فرماتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی غلام آپ کی خدمت میں آیا کرتا تھا وہ بیمار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا اسلام قبول کرلو۔ اس کے پاس اس کا باپ بھی تھا اس نے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے بیٹے سے کہا ابو القاسم (آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات مان لو چناں چہ وہ اسلام لے آیا۔ جب آپ اس کے پاس سے نکلے تو آپ نے فرمایا تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اس کو (ایمان سے) جہنم سے بچا دیا۔ (مشکوٰۃ ۱۳۷)۔ یہ تھا آقا کا درد۔ اس لڑکے کا نام عبدالقدوس تھا۔ (مرقات ۳/۲۷۳)۔

اس سے علماء اسلام نے لکھا ہے کہ کسی بندے پر ایمانی وغیرہ دعوت و محنت سے جب کہ وہ قبول نہ کرے تو مایوس نہ ہونا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں ہدایت نصیب ہو جائے۔

ائمہ حضرات کبھی تنہائی میں یہ سوچ لیا کریں کہ آپ کے اطراف میں بہت سی بستیاں ہوں گی جن میں کافی بڑی تعداد مسلمانوں کی ہوگی، لیکن اتنی بڑی تعداد میں نمازیوں کی تعداد کتنی ہے؟ جو نمازوں سے غافل ہیں ان کی فکر کون کرے گا؟ کیا آپ کی ذمہ داری نہیں۔

بل کہ آپ جہاں امامت وخطابت انجام دے رہے ہیں وہاں کے بارے میں بھی غور کریں کہ کیا آبادی کے سب ہی لوگ پنج وقتہ نمازی ہیں؟ بتائیں ان میں ایسا دینی شوق جگانا جس سے وہ اوامر خداوندی پر مضبوطی سے کھڑے ہو جائیں آپ کی ذمہ داری نہیں؟ لہٰذا ہم اپنا فرض منصبی اچھائی کی دعوت اور برائی سے لوگوں کو بچانا ہرگز نہ بھولیں نہ سفر میں نہ حضر میں۔ آپ کی خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کی محنت کے نتیجہ میں لوگ گناہوں سے باز آجائیں اور بے نمازی نمازی بن جائیں۔ اس کے لیے آپ کو اللہ تعالی سے اس کی توفیق بھی طلب کرنی چاہیے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالی جو جلیل القدر محدث وعارف کامل ہیں فرماتے ہیں۔ ''وَاللهِ لَوْلَمْ يَاتُوْنِي لَاَتَيْتُهُمْ فِيْ بُيُوْتِهِمْ '' اللہ کی قسم ''میرے شاگرد'' اگر میرے پاس حدیث شریف سیکھنے نہ آئیں تو میں ''حدیث شریف'' سکھانے کے لیے ان کے گھروں پر جاؤں گا (کتاب العلم لابن عبدالبر ۱/ ۱۴۲)۔ آپ نے اتنے بڑے محدث کی بات ملاحظہ کی کہ وہ خود ان کے شاگردوں کے پاس جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔

یہ تو حدیث شریف سکھانے کے لیے تھا۔ جب کہ یہاں تو بقول **حضرت مولانا محمد الیاس**ؒ سرے سے دین اور فرائض ہی معدوم ہیں، امہات عقائد ہی کمزور ہیں، امہات عقائد میں امہات کی شان باقی نہیں رہی، جس کی وجہ سے ابواب رحمت بند ہو چکے ہیں۔

اب اگر رات بھر دعائیں کی جائیں تب بھی کام نہ ہوں گے۔ تو اب اس کے لیے کتنی فکر ہونی چاہیے۔ اللہ تعالی ہمیں ان لکھی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ اس وقت جو کچھ دنیا

کی رونق نظر آتی ہے وہ سابق مبلغ وداعی حضرات کی قربانی کا ہی نتیجہ ہے۔

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی فکر ودعوت کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ" حاملین قرآن کی ایک ہی غرض ہونی چاہیے وہ یہ کہ وہ خود بھی نیک ہوں اور اپنے اچھے اخلاق وکردار کے ذریعہ اوروں کی بھی اصلاح کرنے والے ہوں اور امت کی دینی تربیت اور دین کی طرف رہ نمائی کرنے والے ہوں"۔ "یَکُوْنُ الغرضُ الوحیدُ مِنَ الْمُتَخَرِّجِیْنَ فِیْ المدارِسِ الناجِحِیْن فِیْ عُلُومِها اَنْ یَکُوْنُوْا صَالِحِیْنَ فِیْ اَنْفُسِهُمْ. وَاَخلاقُهم واٰدابُهم مُصلِحِیْنَ لِغیرِهِمْ راشِدِیْنَ مُرْشِدِیْنُ مُهْتَمِّیْنَ بَتَرْبیۃِ الْاُمَّۃِ" (وجوب التعاون بین المسلمین ۱؍۲۰۰)۔

نبی کی طرح ائمہ حضرات کو بھی مؤمنین سے توجہ ہٹانی نہیں چاہیے

مسند احمد اور طبرانی کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ سرداران قریش کا گزر ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے ہوا جب کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب حضرت صہیبؓ، عمارؓ، بلالؓ اور خبابؓ وغیرہ ضعفاء مسلمین بیٹھے ہوئے تھے تو سردار ان قریش نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ اپنی قوم کے ان جیسے (کمزور) افراد پر خوش ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان میں سے ان کو منتخب کر کے ان پر احسان کر رکھا ہے کیا ہم ایسے (حقیر وکمزور) لوگوں کے تابع بن کر رہیں، اگر آپ ان کو ہٹا دیں تو ممکن ہیں ہم آپ کی پیروی کرلیں۔تو اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ "وَلَا تَطْرُدِ الَّذِینَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ" (انعام ۵۲) نازل فرمائی ترجمہ: اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالیے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے (ان کا) مقصد صرف اللہ کی رضا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے صرف زبانی گفتگو کو کافی نہیں سمجھا بل کہ ایک تحریری عہد نامہ کا مطالبہ بھی کیا۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو لکھنے کے لیے بلایا

لیکن لکھنے سے پہلے ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام آیت بالا کو لے کر نازل ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو اس سے منع کر دیا کہ غرباء مسلمین سے اپنی توجہ محض ان کافروں کے ایمان لانے کی توقع سے ہٹائیں اور بتلا دیا کہ خواہ یہ لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں آپ غرباء مسلمین کے مقابلے میں اس کی پرواہ نہ کریں۔ (روح المعانی ۷/۲۰۵)۔

آج بہت سے مسلمان (جو دنیوی اعتبار سے تو عزت دار کہلاتے ہیں) ضعف ایمان کی وجہ سے (غیر عزت دار مسلمان کے مقابلہ میں سیاست ومعاملات میں) بہت سے کافروں کی طرف میلان رکھتے ہیں اور اللہ کے دشمن اور اس کے خلیل اور صالح وفاسد اور مومن وکافر کے درمیان فرق نہیں کرتے، بل کہ ان کے ساتھ گہری دوستی رکھتے ہوئے ان کا تعاون بھی کرتے ہیں، قرآن نے اس سے سختی سے روکا ہے۔ ارشاد ہے "وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (ھود ۱۱۳) تم ان لوگوں کی طرف میلان مت رکھو جنہوں نے ظلم کر رکھا ہے ورنہ تمہیں آگ پہنچ کر رہے گی۔

لہٰذا اس ہدایت کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے وارثین علماء کرام وائمہ عظام کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اپنی نگاہ صرف مسلمانوں پر مرکوز رکھیں۔ ان سے دلی محبت رکھیں، بل کہ ان کو اپنے سے قریب کریں وہ چاہے دینی مرتبہ میں کم تر ہوں لیکن ان کے اندر کا ایمان ان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سارے کفار ومشرکین سے بلند بنا دیتا ہے۔ اگر ان کے اندر عیوب ہوں تو جذبۂ خیر خواہی اور شفقت وترحم سے ان کو دور کر کے انہیں معزز بنائیں۔ یہی طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

جب بھی ائمہ حضرات کے پاس لوگ آئیں تو پہلے انہیں نصیحت کریں

ائمہ حضرات کی یہ بھی ایک بڑی خوبی اور صفت ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی کسی

بھی غرض سے آتا ہے تو اسے ضرور نصیحت کرتے اور دینی بات سمجھاتے ہیں۔قرآن شریف نے اس گوشہ کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے سمجھایا ہے۔جب یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پہنچے تو ان کے ساتھ دو قیدی بھی قید خانہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے،ان کو معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں تو انہوں نے اپنے خوابوں کا تذکرہ کیا لیکن سیدنا یوسف علیہ السلام نے پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ میں تم کو تمہارے خوابوں کی تعبیر جلد ہی بتاؤں گا اور ضرور بتاؤں گا،

پھر دین کی نصیحت کی،لیکن دین کی نصیحت بھی بڑی حکمت سے کی۔پہلے یہ بتایا کہ یہ علم میرا ذاتی نہیں بل کہ یہ مجھے میرے رب نے عطا کیا ہے۔(کیوں کہ) میں نے ان لوگوں کا مذہب چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں۔ ''ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ '' (یوسف ۳۷)۔

اس طرح طویل تمہید کے بعد اب نصیحت شروع کی اور دین کی دعوت پیش کی۔''يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ'' (سورۃ یوسف ۳۹) اے قید خانہ کے میرے دوستو(بتاؤ) مختلف رب (ماننا) بہتر ہیں یا وہ اللہ جو کہ تنہا ہے اور قہار ہے۔

مفسرینؒ نے یہاں بڑی نفیس بحث کی ہے آپ تفسیر سے معلوم کر سکتے ہیں۔یہاں ضروری بات یہ ہے کہ قیدی لوگ اپنی غرض لے کر آئے تھے لیکن یوسف علیہ السلام نے ان کو پہلے دین کی نصیحت کی۔لہٰذا ہم ائمہ کو بھی (وراثت کے ناتے) چاہیے کہ جب بھی ہم سے متعلق کوئی شخص کام لے کر آئے تو اسے دینی نصیحت کے بغیر نہ چھوڑیں۔جو شخص دین کے جس معیار کا ہو اعلیٰ اوسط ادنی اسے اس کے معیار سے اوپر کی نصیحت ضرور کریں۔مثلاً نمازوں کا اہتمام،شرم و پاکبازی،اخلاق و کردار وغیرہ ان شاء اللہ چند سالوں میں آپ اچھا معاشرہ دیکھ سکیں گے۔

یوسف علیہ السلام کا تأثر قیدیوں پر

جب یوسف علیہ السلام قید میں داخل ہوئے تو اس میں ایسے قیدیوں کو پایا جو زندگی سے مایوس، سخت مصائب سے دوچار تھے جن کا غم طویل ہو چکا تھا۔ تو یوسف علیہ السلام نے داخل ہوتے ہی فرمایا تم لوگ خوش ہو جاؤ اور صبر کرلو تمہیں اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔ تو انہوں تعجب سے کہا اے نوجوان اللہ تمہیں برکت عطا فرمائیں آپ کس قدر حسین سیرت وصورت کے مالک ہیں، ہمیں آپ کی اس صحبت سے برکت کی امید ہے، لیکن ہمیں حیرت یہ ہے کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں تب سے ایسی خبر آپ کے سوا کسی نے نہیں دی ہمیں کسی نے بھی ایسی تسلی نہیں دی کہ صبر پر اجر وثواب حاصل ہوگا نیز مصائب پر صبر سے گناہوں کا کفارہ حاصل ہوگا اور ان سے صفائی حاصل ہوگی آخر آپ ہیں کون؟ (روح المعانی ۵۹۲/۱۲، ۵۸۴)۔

دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدیوں کو اول ملاقات میں کیسا متأثر کر دیا، ہم بھی مغموموں کے غم میں حصہ دار بنیں، مصیبت زدہ کے ساتھ روئیں اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کے آنسوں پونچھیں اس طرح اپنی دعوت کو مؤثر بنائیں۔ پھر ان کو نصیحت کریں۔ وہ ضرور آپ کی نصیحت کو قبول کریں گے۔

(۹) ائمہ حضرات معلّم الناس ہیں، تعلیم ناس مقدم ہے نوافل پڑھنے پر

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں امام الانبیاء والمسلمین تھے وہاں آپ معلّم امت بھی تھے۔ ارشاد ہے "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً" کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ نے جہاں صحابہ کی نمازوں میں امامت فرمائی ہے وہاں آپ نے ان کو زیور علم سے آراستہ بھی فرمایا ہے۔ لہٰذا ائمہ حضرت کو بھی چاہیے کہ امامت کے ساتھ مقتدیوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھیں۔

چناں چہ مختلف روایتوں میں وارد ہے کہ کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو قرآن شریف کی

چند آیتیں، کسی کو ثنا، کسی کو دعائیں، اور کسی کو ذکر اللہ کے مختلف کلمات، کسی کو تشہد اور کسی کو مسنون دعا وغیرہ سکھلائیں۔

حتی کہ آپ نے اپنی حیثیت ہی معلم کہہ کر یہ سمجھادی کہ نبی اپنی امت کے لیے ایک بے غرض غیر تنخواہ دار ہر وقت سکھلانے والا معلّم ہوتا ہے اور معلم یعنی سکھلانے والا کہہ کر سکھلانے والے اور پڑھانے والے میں فرق سمجھا دیا کہ آپ صرف پڑھانے والے ہی نہیں بل کہ سکھلانے والے ہیں۔ سکھلانے والا وہ ہوتا ہے جو متعلم کو سکھلا کر چھوڑے۔

حضرت کریب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فریضۃ العصر پڑھنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھی باوجودیکہ آپ عصر کی نماز کے بعد کوئی اور نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان پڑھی ہوئی دو رکعتوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس وفد عبدالقیس آیا تھا (ان کی تعلیمی) مصروفیت سے ظہر کے بعد کی دو رکعت سنت پڑھنے سے رہ گئی تھی وہ میں نے پڑھی ہے۔ (مشکوٰۃ ۹۴)۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کیسے معلم تھے کہ امت کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے ذاتی معمول کو بھی مؤخر کیا[۱]۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنت الظہر چھوڑ کر وفد ابی قیس کو تعلیم دینے سے علماء اسلام نے یہ سمجھا ہے کہ لوگوں کو دین سکھلانا نوافل پڑھنے پر مقدم ہے اور اگر شدید ضرورت ہو تو سنن رواتب پر بھی مقدم ہے (مرقات ۳/۴۶)۔ (مسجد میں تعلیمی حلقوں کی بحث جزء چہارم میں ہوگی)۔

دینی تعلیم نبوی درسگاہ کا وہ سبق ہے جسے معلم امت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو ایمان کے بعد سب سے پہلے پڑھایا ہے۔ اسی لیے سینکڑوں احادیث میں علم کی عبادت پر اور علماء کی

---

[۱] جس سنت الظہر کا تذکرہ اس حدیث شریف میں ہے اس کا درجہ تمام سنن رواتب میں تیسرا ہے۔ اول تو سنت الفجر ہے پھر سنت المغرب ہے پھر سنت الظہر۔

عابدوں پر فضیلتیں وارد ہیں۔ وجہ فضیلت یہ ہے کہ علم سے جہالت دور ہوتی ہے، اور علم ہی شیطان کے مکر کا توڑ ہے۔ نیز علم کا فائدہ متعدی ہے جب کہ عبادت کا لازم۔

تعلیم نبوت کی طاقت، معجزہ کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے

علمائے اسلام نے علماء حضرات کے لیے ایک بڑی عمدہ اور اہم بات لکھی ہے، غور سے پڑھیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت ہم پر منکشف فرمائیں۔

کم تنخواہ کے باوجود مکتب و مدارس کے اساتذہ کا ۴۰/۵۰ سال طویل عرصہ ہمہ تن دینی تعلیم میں اشتغال کی قوت، قوت معجزہ سے کم نہیں۔ آپ کو ضرور تعجب ہوگا کہ یہ کیسے؟ اسی کو سمجھانے اور اس کا یقین دلانے ہی کے لیے یہ عنوان مرتب کیا ہے۔ اللہ کرے یقین حاصل ہو۔

معجزہ دلیل نبوت ہے نہ کہ مقصد نبوت

ہر دعویٰ کی ایک دلیل ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ یہ مکان میرا ہے، یہ بیٹا میرا ہے تو یہ اس کا دعویٰ ہے یہ دعویٰ اس وقت درست ہوگا جب کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل پیش کرے۔ اسی طرح نبی و رسول کا یہ کہنا کہ میں نبی یا رسول ہوں یہ نبوت و رسالت کا دعویٰ ہے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام بھی اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں دلیل رکھتے ہیں اور وہ دلیل ان کا معجزہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینکڑوں معجزات ہیں۔[1]

---

[1] مثلاً شق القمر کا معجزہ کہ آپ نے چاند کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا تو اس کے دو ٹکڑے کردیئے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے سورج کو غروب ہونے کے بعد دوبارہ لوٹا یا اور نکالا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جو جادوگروں کے تمام سانپوں کو ایسا بڑا اژدہا اور سانپ بن کر نگل جاتا تھا، کہ جب وہ اپنا جبڑا کھولتا تو اوپر نیچے کے ہونٹ کے درمیان فرعون کا پورا محل آجاتا یہ اس فرعون کے لیے عذاب اور دردسر تھا جس کے سر میں چار سو سال تک درد نہیں ہوا۔

بہر حال ہر نبی ورسول کو دو چیزیں عطا کی جاتی ہیں ایک نبوت ورسالت دوسرا معجزہ۔ نبوت ورسالت مقصد اور دعویٰ ہوتا ہے، اور معجزہ اس کی دلیل اسی کو یوں بھی کہہ لیں کہ ہر نبی کو من جانب اللہ دو چیزیں عطا کی جاتی ہیں۔ ایک تعلیم دوسری تائید۔

تعلیم دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اس کا مکلف کیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو فکری ونظری طور پر توحید کی تعلیم دے کر ان کو شرک وکفر اور جہالت وبدعات سے نکال کر وحدانیت وسنت اور علم وہدایت کی طرف بلائے اور عملی طور پر معاصی ومنکرات سے نکال کر طاعت وعبادت اور اخلاق وکردار کی طرف بلائے۔ یہ تعلیم اس کے فرائض ومقاصد میں سے ہے اور اس کا درجہ ایسا ہی ہے جیسا جسم میں روح کا۔

اور تائید نبوت دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ نبی کی دعوت اور تعلیم کا انکار کر دیں اور اس کی تصدیق کے لیے کوئی دلیل طلب کریں کہ جب تک دلیل سے ہمیں یقین نہیں دلائیں گے تب تک ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ تو من جانب اللہ نبی کو (اس کی دعوتِ رسالت کی تصدیق کے لیے) دلیل دی جاتی ہے جس دلیل کو اصطلاح شرع میں معجزہ کہتے ہیں۔ [1] یہ معجزہ مقصد نبوت نہیں ہوتا بل کہ مقصد کی تائید ہوتا ہے۔ یہ ہُوا تائید نبوت (نبراس ۴۸۳ وجواہر الفرائد ۶۳۶)۔

مذکورہ تفصیل سے آپ نے سمجھ ہی لیا کہ معجزہ کی طاقت کیا ہوتی ہے حالاں کہ معجزہ نبوت ورسالت کا مقصد نہیں بل کہ وہ مقصد کے لیے صرف دلیل وتائید ہوتا ہے۔ تو اندازہ کیجئے جو چیز مقصد ہوگی یعنی نبوت ورسالت اور نبی کی تعلیم اس کی طاقت کیا ہوگی! بلفظ دیگر! دو نظام ہیں۔

---

[1] معجزہ نبی کے ہاتھ عادت واسباب کے خلاف ظاہر ہونے والے امر کو کہتے ہیں۔ اور اس کو معجزہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس جیسے امر کو دوسرے لوگ پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔

تکوینی نظام اور تشریعی نظام

(۱) تکوینی نظام مثلاً: آسمان وزمین کی تخلیق ان کی گردش، چاند وسورج اور سیاروں کی روش، مادی منفعتوں کے ذرائع اور ہواؤں، موسموں اور بارشوں وغیرہ کا نظام۔

(۲) تشریعی نظام مثلاً: نماز وروزہ وغیرہ عبادتیں، اوامر واعمال کا امتثال اور نواہی ومعاصی سے اجتناب، دینی علوم اور حفاظت دین اور اس کی اشاعت وغیرہ۔

دونوں کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی انجینیر نے کوئی بڑی مشین بنائی جو قیمتی بھی ہو نفیس بھی۔ لیکن یہ صرف مشین کا ڈھانچہ اور اس کی صورت ہے جس سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ساکن اور غیر متحرک ہے لیکن جب اس کے ساتھ بجلی سے ربط پیدا کر کے بجلی کی لہر اس میں دوڑا دی جائے تو وہ حرکت کرنا شروع کرے گی اور اس کی افادیت حاصل ہوگی۔

تکوینی نظام تو مشین کے ڈھانچہ کی طرح ہے اور تشریعی نظام بجلی کی رو اور لہر کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو بنایا جس میں ساری ضرورتوں کا انتظام فرمایا پھر نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ شرعی نظام قائم کیا تو گویا مادی کائناتی نظام کی جان اور روح شرعی نظام ہے جو اصل خلقت کا منشا ہے۔ سوچیے ہم کس قدر سعادت مند ہیں کہ ہم (ہمارا تعلیمی اشتغال) کائناتی نظام کی جان ہیں اور ہم کائنات کی خلقت کے اصل منشا میں مصروف ہیں۔

سوچیے اگر اپنے زمانہ کے کسی ولی کامل سے خارق عادت کسی کرامت کو کھلی آنکھوں دیکھ لیں: مثلاً ہوا میں اڑتے دیکھ لیں جیسا کہ شیخ احمد خضرویہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مریدین کے بارے میں لکھا ہے، ’’كَانَ لِلشَّيخِ اَحْمَدَ خَضْرَوِيَّةَ اَلْفُ مُرِيْدٍ يَمْشُوْنَ عَلَى الْمَاءِ وَيُطِيْرُوْنَ عَلَى الْهَوَاءِ‘‘ (نبراس ۲۹۷)۔ تو کیا ہمارے حیرت کی کوئی انتہا ہوگی! کیا اتنی حیرت ہمیں مقصد

نبوت یعنی تعلیمی مصروفیت میں ہے جس کا درجہ اس کرامت سے بڑھ کر ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس تعلیم پر کبھی یہ تصور نہیں ہوتا کہ ہم ایک بلند مقصد نبوت میں مصروف ہیں۔حالاں کہ جتنی طاقت کرامت کی ہے اس سے کہیں زیادہ طاقت تعلیم کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم تعلیمی تقاضوں کے انجام دینے میں پورے طور پر کوتاہی کے مرتکب ہیں۔ نہ طلبہ کی سچی خیر خواہی نہ دل کی صفائی نہ ہمہ تن علمی انہماک نہ اس نعمت کی شکرگزاری۔اللہ تعالیٰ تعلیم کی قدر دانی ہمیں نصیب فرمائیں۔آمین۔لہٰذا ائمہ کو چاہیے کہ اپنے مقتدیوں کو سبقاً سبقاً تعلیم سے خوب آراستہ کریں۔

معاشرے کو قرآنی تعلیم سے آراستہ کرنا

ائمہ کی یہ بھی ایک صفت وخوبی ہے کہ قوم نے انہیں جن اہم مقاصد کے پیش نظر امامت جیسے منصب پر فائز کیا ہے ان مقاصد کے حصول سے ان کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرآن کی تعلیم ہے جس کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔اور کمال یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کی نسبت اپنی طرف کی ہے ۔ارشاد ہے "اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝" (سورۃ الرحمن)۔ رحمن نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا، اس نے اس کو بیان سکھایا۔

---

[1] چناں چہ کتب تصوف میں کرامت کی دو قسموں سے بھی مذکورہ بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ کرامت کی دو قسمیں ہیں۔ایک کرامت حسّی جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہونا، پانی پر چلنا وغیرہ، عوام لوگ اسی کو کمال شمار کرتے ہیں۔دوسری کرامت معنوی یعنی شریعت پر قائم رہنا۔مکارم اخلاق کا خوگر ہونا۔نیک کاموں کا پابندی وبے تکلفی سے صادر ہونا کہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے۔خواص کے نزدیک یہی کرامت اصل ہے۔جس میں استدراج کا دخل نہیں برخلاف قسم اول کے اس میں استدراج کا احتمال ہے (کرامات حضرت شاہ امداد اللہ قدس سرہ ۱۱، ۱۴)۔اسی لیے صوفیہ کہتے ہیں "الاستقامۃ فوق الف کرامۃٍ"۔۔۔

اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں اگر کوئی نعمت بڑی ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔اس لیے کہ وہ دین و دنیا اور معاش و معاد کی تمام خیر و برکات کا سرچشمہ ہے، اگر چہ انسان کی تخلیق بھی اللہ کی ایک نعمت ہے لیکن تعلیم اس سے بھی بڑی نعمت ہے۔غالباً اسی لیے تعلیم قرآن کو مقدم کیا ہے ''عَلَّمَ الْقُرْآنَ'' حالاں کہ طبعی طور پر تخلیق مقدم ہے اور تعلیم مؤخر۔تعلیم قرآن کو مقدم کر کے شاید اسی طرف اشارہ کرنا ہے کہ تخلیق کا مقصد ہی تعلیم اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

تعلیم قرآن کو ذکر کرنے کے بعد تعلیمِ بیان کو ذکر کیا ''عَلَّمَهُ الْبَیَانَ'' کیوں کہ تعلیم قرآن کا افادہ و استفادہ بیان پر موقوف ہے، کیوں کہ عادۃً جو شخص قرآنی تعلیم لیتا دیتا ہے وہی اس کی تعلیم دینے پر قادر ہوتا ہے۔اور تعلیم بیان میں ہر قسم کی تعلیم شامل ہے چاہے زبانی ہو کہ تحریری یعنی افہام و تفہیم کے جتنے ذرائع ہیں وہ سب ہی۔اور یہ بھی عام ہے کہ جس زبان میں، جس علاقہ میں اور جس قوم میں بھی ہو یہ سب ہی تعلیم بیان کے اجزاء ہیں (معارف القرآن ۸/۲۴۳)۔

قرآنی تعلیم کا مطلب

معاشرہ کو قرآن کی تعلیم دینا اللہ کی نگاہ میں مکرم بنانا ہے۔لہٰذا ائمہ کرام معاشروں کو قرآنی تعلیم سے آراستہ کر کے انہیں رحمن کی نگاہ میں معزز و مکرم بنائیں۔قرآنی تعلیم کا مطلب صرف یہ نہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن سکھایا جائے، ہاں وہ بھی اس کا ایک حصہ ہے۔بل کہ مطلب یہ ہے کہ قوم میں جو دینی مختلف کمزوریاں پائی جائیں ان کو بذریعہ مؤثر بیان ''عَلَّمَهُ الْبَیَانَ'' دور کرنا اور ان کو دینی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا ہے۔مثلاً:

(۱) ائمہ اگر عقائد کے باب میں شکوک و شبہات محسوس کریں تو عقائد صحیحہ کے ذریعہ ان کا ازالہ کریں۔

(۲) عقائد درست ہوں لیکن دلوں کا اعتماد ویقین کمزور ہو بایں معنی کہ لوگوں کا یقین اسباب ومخلوقات پر ہوتو اسباب اور مخلوقات کا یقین نکال کر مسبب الاسباب اور خالق کا یقین پیدا کریں۔

(۳) دنیوی زندگی کی طرف رجحان کو غالب پائیں تو اس کی فنائیت اور آخرت کی ابدیت کو سمجھا کر آخرت کی طرف راغب کریں۔

(۴) اعمال واخلاق میں کمزوری محسوس کریں تو اعمال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فتح وکامیابی کے منحصر ہونے کو سمجھا کر نبوی اعمال اور نبوی تہذیب پر کھڑا کریں۔

اس طرح کی قرآنی تعلیم مقصود ہے جو ائمہ حضرات کا ایک فرض منصبی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔آمین۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی علماء حضرات کو نصیحت

دینی تعلیم وتبلیغ اور اصلاح مسلمین کی اہمیت کو بڑے حسین اسلوب میں ماضی قریب کے ایک اللہ کے بڑے ولی **حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے،ہم استفادہ کی غرض سے اسے پیش کرتے ہیں۔

حضرات علمائے کرام اپنے اپنے حلقہ میں دین کے پیشوا اور قوم کے مقتدا ہیں ان کے اس رفیع منصب کے لحاظ سے ان پر گراں قدر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔اس لیے ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ ان عظیم الشان ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں اور ان سے عہدہ برآں ہونے کی تدابیر اختیار کریں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو امانت ہمارے ذمہ سپرد ہوئی ہے اس کے لیے ہم فکرمند ہوں اور امت کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر چلانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

جو حضرات امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں انہیں اس بات کی حرص ہونی چاہیے کہ ان کے وجود سے علاقے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچے۔ اور لوگوں کا تعلق مساجد سے قائم ہو جس کے لیے ذیل کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

ا : جمعہ کے خطبات کیف ما اتفق نہ ہوں بل کہ ان کے لیے اہم دینی موضوعات کو ایک خاص ترتیب سے منتخب کیا جائے۔ اور جس موضوع پر خطاب کرنا ہو اس کے لیے پوری تیاری کی جائے، مؤثر انداز میں موضوع کا حق ادا کیا جائے، ترغیبی پہلو کو غالب رکھا جائے اور بات ایسے جچے تلے جملوں میں پیش کی جائے کہ جس سے نہ صرف بات ذہن نشین ہو جائے بل کہ سامعین کی فکری وعملی اصلاح بھی ہو۔

ب : جن مساجد میں مکاتب قرآنیہ کا نظم نہیں وہاں اس کو قائم کیا جائے۔ اور جہاں اس کا نظم ہو وہاں اس کی نگرانی سے اسے مزید مضبوط بنایا جائے اور ترغیب سے والدین کو آمادہ کر کے بچوں کو لایا جائے تا کہ محلہ کا ایک بھی بچہ ناظرہ قرآن پڑھنے سے محروم نہ رہے اور ناظرہ کے بعد بھی حفظ قرآن شریف کی ترغیب دی جائے۔

ج : نوجوان طبقہ کو دین سے مانوس کرنے کی سعی کی جائے اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بھی وقت فارغ کیا جائے (تعلیم بالغان کا نظم کیا جائے)۔

د : جن مساجد میں تبلیغی جماعت کے حلقے قائم ہیں، ان سے ربط رکھا جائے ان کی بھر پور اعانت وسرپرستی کی جائے اور نوجوانوں کو ترغیب دے کر تبلیغی جماعت سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔ (از تحفۃ الائمہ ۲۱۵)

ھ : قرآن کریم، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسائل فقہیہ کا درس باقاعدگی کے ساتھ دیا

جائے جس کے لیے کوئی مناسب وقت تجویز کیا جائے۔[۱]

نوٹ : یادرکھیں کہ تبلیغی جدوجہد سے یا تعلیم ناس سے یا تفسیر واحادیث کے درس سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور لوگوں کو صرف اور صرف دین سے جوڑنا ہوتا کہ حقیقی معنی میں لوگ دیندار بنیں۔اپنی ذات سے یا ہماری کوئی خاص محنت سے جوڑنے کا خیال نہ ہو۔

علماء کے عمل کی قوت اور اس کی تاثیر

حضرات ائمہ ایک بات ذہن نشین رکھیں کہ شریعت عوام الناس کا وزن جس میزان سے کرتی ہے علماء کا وزن اس میزان سے نہیں کرتی۔جس طرح کافر کا وزن مؤمن کی میزان سے نہیں کرتی " هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ " ۔اور " اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَّا يَسْتَوٗنَ " ۔علماء جس طرح وصف علم میں عوام سے ممتاز ہیں اس طرح وہ فکر وعمل کے اوصاف میں بھی ان سے ممتاز ہوں۔علماء کے فکر واعمال کی پرواز نہایت ہی بلند اور ان کے کردار نہایت ہی ممتاز ہوتے ہیں۔کہیے کہ وہ ذائقہ میں شیریں، منظر میں دلکش، وزن میں بھاری اور اثر میں مقناطیس ہوتے ہیں۔ان کے عمل کی قوت پر ذیل کا واقعہ ملاحظہ ہو۔

---

[۱] شیخ الحدیث حضرت مولانا فضل الرحمن اعظمی مدظلہ العالی آج کل ساؤتھ افریقہ میں ہیں اور ان کی کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت مقبولیت دے رکھی ہے۔حال ہی میں مکتبہ دارالھدیٰ سے ان کا ایک کتابچہ "کیا تبلیغی کام ضروری ہے؟" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کتاب میں حضرت والا نے تبلیغی کام کی ضرورت واہمیت پر بہت ہی مفید ابحاث فرمائی ہیں۔ائمہ حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" اور حضرت مولانا محمد منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "ملفوظات مولانا الیاس" واقعی اس لائق ہیں کہ ہر امام صاحب اپنی لائبریری میں ان کو رکھیں اور عوام الناس کو بھی ان کا مطالعہ کرائیں۔تا کہ وہ بھی حکمت وبصیرت کے ساتھ اس تبلیغی کام کو کرنے والے بنیں اور دوسروں کے لیے بھی بہترین نمونہ ہوں (از تحفۃ الائمۃ حضرت مولانا محمد حنیف عبدالمجید صاحب، سابق استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، پاکستان)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اصول حدیث کے ضمن میں علماء کے عمل کی قوت پر جو فیصلہ کیا ہے اسے بغور پڑھیں اور اپنے کو بھی اس پر ڈھالنے کی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ امام ترمذی کو جزاء خیر عطا فرمائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "اِذَا اَتَی اَحَدُکُمُ الصَّلٰوۃَ وَالْاِمَامُ عَلیٰ حَالٍ فَلْیَصْنَعْ کَمَا یَصْنَعُ الْاِمَامُ" (ترمذی۔ مشکوٰۃ ۱۰۲) جب تم میں سے کوئی شخص (جماعت کی حاضری کے لیے) نماز کو آئے اور امام کسی حالت میں ہو تو امام جو کچھ کر رہا ہو تو وہ بھی وہی کرے۔ یعنی امام اگر رکوع یا سجدہ وغیرہ جس حال میں ہو تو آنے والا شخص بھی اس عمل میں شامل ہو جائے چاہے رکعت محسوب نہ ہو۔

اس حدیث شریف کو امام ترمذیؒ نے غریب کہا ہے [۱]۔

پھر آگے لکھا ہے "وَالْعَمَلُ عَلٰی ھٰذَا عِنْدَ اَھْلِ الْعِلْمِ" کہ اگرچہ حدیث غریب ہے تاہم علماء اسلام کا اس حدیث پر عمل رہا ہے۔

امام ترمذی کا یہ ارشاد کہ اگرچہ حدیث غریب ہے لیکن علماء کا اس پر عمل ہے دبے جملہ میں وہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اسے علماء کے عمل سے تقویت حاصل ہے چناں چہ ملا علی قاریؒ نے یہ جملہ نقل کیا ہے۔ "فَکَاَنَّ التِّرْمِذِیَّ یُرِیْدُ تَقْوِیَۃَ الْحَدِیْثِ بِعَمَلِ اَھْلِ الْعِلْمِ"۔ مذکورہ بات سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ علماء کا عمل کتنی اہمیت رکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اسے حدیث کی تقویت کا ذریعہ بنایا۔ اور اس قابل بنایا کہ اس پر عمل کیا جائے۔

---

[۱] غریب اصول حدیث میں اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کو نقل کرنے والا راوی ایک ہی شخص ہو۔ چاہے تمام طبقات میں ایک ہی ایک ہو یا کسی طبقہ میں زائد بھی ہو گئے ہوں۔ (غریب کو یہ نہ سمجھیں کہ وہ ضعیف ہوتی ہے غریب بھی صحیح ہو سکتی ہے جس طرح وہ ضعیف ہو سکتی ہے)۔

چناں چہ اس کی تائید فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس محتاط قول سے بھی ہوتی ہے جو تراویح کے بارے میں کتب فقہ میں مذکورہ ہے۔ فقہاء کا قول ہے: پیشوا اور راہ نمائے دین کے لیے مسجد میں نماز تراویح پڑھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ پیشوا اور علماء کے قول وفول کو لوگ حجت مانتے ہیں، اگر وہ گھروں میں پڑھیں گے تو عوام بھی سستی کریں گے۔ ''اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ فَقِیْهًا عَظِیْمًا یُقْتَدٰی بِهٖ فَیَکُوْنُ فِیْ حُضُوْرِهٖ تَرْغِیْبٌ لِغَیْرِهٖ وَفِیْ اِمْتِنَاعِهٖ تَقْلِیْلُ الْجَمَاعَةِ '' (نور الایضاح ۹۹ حاشیہ ۱۱)۔ برخلاف عامۃ المسلمین کا قول وفعل (اگر وہ گھروں میں پڑھیں) کہ اس کو کوئی دلیل نہیں بنا تا جس سے دین کا نقصان متعدی نہیں ہوتا۔

اسی کی ایک دوسری مثال ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے اور واقعہ امام الحرمین شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ شیخ امام الحرمینؒ فرماتے ہیں کہ مجھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ جو شخص (لا الہ الا اللہ) ستر ہزار مرتبہ پڑھے تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے، اور اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پڑھا جائے۔ چناں چہ میں اس پاک کلمہ کو اس عدد کے مطابق پڑھا کرتا تھا اور خاص کسی کی نیت نہیں کرتا تھا۔

اتفاق سے ایک دن میں اپنے رفقاء کے ساتھ ایک دعوت میں شریک تھا وہاں ایک نوجوان بھی تھا جو کشف کے معاملہ میں پہلے سے مشہور تھا وہ کھانے کے دوران رونے لگا، میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے میں نے اسے بذریعہ کشف عذاب میں دیکھ لیا۔ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے دل ہی دل میں کلمۂ مذکورہ کا ثواب اس کی ماں کو بخش دیا جس کا اسے پتہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا اب میں اپنی والدہ کو خوشی وراحت میں (جنت میں) دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد شیخؒ نے بڑی حیرت کی بات کہی کہ میں نے اس حدیث (ستر ہزار والی) کے صحیح ہونے کو اس نوجوان کے کشف سے سمجھا اور اس کے کشف کے صحیح ہونے کو اس حدیث سے سمجھا۔ یعنی ایک کے صحیح ہونے کو دوسرے سے سمجھا۔ (مرقات ۹۸/۳)۔ مذکورہ واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ کسی کے کشف کا عمل بھی حدیث کے صحیح ہونے کا ذریعہ ہے۔ اگرچہ وہ عندالمحدثین حجت ہے یا نہیں وہ قابل بحث ہے۔

خیر یہ اس زمانہ کی بات تھی جب خیر کسی قدر غالب تھا۔ لیکن آج بھی علماء کے عمل کی اعلیٰ حیثیت سے کسی کو انکار نہیں یعنی آج بھی لوگ علماء کے بلند کردار کے خواہش مند ہیں۔ عوام تو عوام علماء بھی دوسرے علماء کو متقی وزاہد امین وصادق، مشفق وناصح اور باعمل وبااخلاق اور مخلص دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کو بااثر دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے اعمال وکردار کو باقوت وبااثر بنائیں یعنی پہلے ہم اپنے کو ایسا بنا کر دکھادیں اور پھر دوسروں کو بنا کر دکھائیں۔

جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے اس سے بھی بچنا ضروری ہے

مذکورہ بالا مضمون (علماء کے عمل کی قوت) کے بیان سے معلوم ہوا کہ ائمہ حضرات کو ہر ایسے کام سے سخت اجتناب کرنا چاہیے جن سے ان کا تقویٰ وثقاہت اور ان کی عدالت اور ان کی شخصیت متأثر ہوتی ہو۔ مثلاً کذب وخیانت وغیرہ۔ جس طرح حدیث شریف کو قبول کرنے کے لیے حدیث کے راویوں میں سب سے پہلے یہی دیکھا جاتا ہے کہ کیا کسی حدیث کا راوی جھوٹ و خیانت کا مرتکب تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔ لہٰذا ضروری سمجھ میں آرہا ہے کہ ہم کذب کو مع اس کی اقسام بیان کریں۔ تاکہ ائمہ حضرات ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

کذب دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک کذب صریح۔

دوسرا کذب خفی۔

عامۃً دیندار طبقہ کذب صریح سے اجتناب کرتا ہے۔ کیوں کہ کذب صریح سے آدمی کی شخصیت مجروح ہوجاتی ہے اور ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ علمائے اسلام نے احادیث کے ضمن میں بڑی عجیب بات لکھی ہے وہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مشرکین شرک تو کرتے تھے لیکن جھوٹ نہیں بولتے تھے ان کے نزدیک بھی کذب ایسی مذموم چیز تھی جس سے وہ بھی اجتناب کرتے تھے لیکن آج مسلمان ہوکر آدمی جھوٹ بولتا ہے۔

دوسری قسم ایسی ہے جس سے دیندار طبقہ بھی احتیاط نہیں کرتا۔ اور ستم بالائے ستم اسے جھوٹ بھی نہیں مانا جاتا بل کہ اس پر سچائی اور حقیقت کا پردہ ڈال کر اس کو چھپایا جاتا ہے۔ بہر حال جو حکم اور نتیجہ کذب صریح کا ہے وہی کذب خفی کا بھی ہے۔

پھر کذب کی دوسرے لحاظ سے دو قسمیں ہیں۔

ایک کذب قولی۔

دوسری کذب فعلی وعملی۔

کذب قولی ظاہر المعنی ہے۔ لیکن کذب عملی خفی المعنی بھی ہے اور قلیل العلم بھی۔ اس لیے ہم اس کو حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات وہ عمل سے بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل اختیار کرتا ہے جو درحقیقت خلاف حقیقت یعنی جھوٹ ہوتا ہے۔

مثال اس کی یہ ہے کہ حدیث شریف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ یُعْطَ کَلَابِسِ ثَوْبَیْ زُوْرٍ“ (بخاری شریف ۷۸۵)۔شکم سیری کا مظاہرہ کرنے والا ایسی چیز سے جو اسے نہیں دی گئی ہے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔یعنی جو شخص اپنے کسی بھی عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا وہ حقیقت میں نہیں ہے یہ دوہرا جھوٹ اختیار کرنے والے کے مانند ہے اور وہ سراپا جھوٹا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲۰۶)۔یعنی اپنی اداؤں،نشست و برخواست اور اپنے طرز زندگی سے خلاف حقیقت کا اظہار کرے تو وہ سر سے پیر تک جھوٹا ہے۔بالفاظ دیگر تکلفات وتصنعات میں غلو سے کام لے یہ عملی جھوٹ ہے۔

آج کل عوام وخواص میں اپنی مصنوعی عزت و برتری جتانے کے لیے حقیقت کے خلاف قول وعمل اختیار کرنا اس قدر عام ہو رہا ہے کہ۔اللہ کی پناہ۔جس کو ہر شخص جانتا ہے حالاں کہ یہ جھوٹ ہے شریعت کو چھوڑ کر آدمی عنداللہ عزت دار نہیں ہوسکتا اور بالکل نہیں۔اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔روایت میں ہے کہ مؤمن میں ہر خصلت وعادت ہوسکتی ہے لیکن خیانت وجھوٹ نہیں ہوسکتی (مشکوٰۃ ۴۱۴)۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قبیح اور مذموم خصلت سے محفوظ رکھیں۔آمین۔مذکورہ عملی جھوٹ کی مناسبت سے سمجھ میں آرہا ہے کہ آخرت کے عملی انکار سے بھی آگاہ کیا جائے۔کہ دونوں عملی ہیں اور شدید قبیح بھی۔

انکارِ آخرت کی عملی شکل

آخرت کا ایک انکار تو صریح ہوتا ہے جو بالکل واضح ہے جیسے کفار ومشرکین اور ہندوستانی ہندوؤں کا انکار وغیرہ۔لیکن ایک انکار عملی ہوتا ہے عامۃً اس کو انکار سمجھا نہیں جاتا۔اور اس کا اشارہ خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ارشاد ہے ”فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ

یُرِدْ اِلَّا الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا. ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِنَ الْعِلْمِ ''(نجم ۲۹)۔آپ ایسے لوگوں سے اپنا خیال ہٹالیجیے جو ہماری یاد سے رخ پھیرلیں،اور دنیوی زندگی کے سواان کا کوئی مقصد نہ ہو یہی ان کا منتہائے علم (ہنر) ہے۔

مفسر قرآن حضرت **مفتی محمد شفیع صاحب** رحمہ اللہ تعالی لکھتے ہیں کہ یہ ان کفار کا حال بیان ہوا ہے جو آخرت وقیامت کے منکر ہیں جن کا مطمح نظر دنیا اور دنیوی مادی اسباب اور علم وہنر ہیں۔لیکن افسوس ہے کہ انگریزوں کی تعلیم نے اور دنیوی ہوا وہوس نے آج ہم مسلمانوں کا حال بھی یہی بنا رکھا ہے !! کہ ہمارے سارے علوم وفنون اور علمی ترقی کی ساری کوششیں صرف معاشیات کے گرد گھومتی ہیں۔(معارف القرآن ۸/۲۱۱)۔

اس کے بعد حضرت نے تفصیل بیان کی ہے اور کلی طور پر دنیا کی طرف توجہ کرنے پر آیت شریفہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ بھی آخرت کا انکار ہے چاہے عملاً ہے۔حضرت **مفتی صاحب**ؒ کے جملوں پر غور فرمائیں کتنی حسرت سے فرمارہے ہیں کہ دنیوی ہوس نے آج ہم مسلمانوں کا حال یہی بنا رکھا ہے۔آیئے ہم جائزہ لیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا ایک طبقہ تو بالکل غیر مسلموں کی طرح عصری تعلیم سے مقصد صرف اچھی ملازمت حاصل کرنا اور مال ودولت کو خوب جمع کرنا جانتا ہے اور ان کے طرز زندگی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کمائی کی ایک مشین اور کمائی کا ایک جانور (حیوان کاسب) ہے جن کی صبح وشام اور شب وروز ایک ہی دُھن ہوتی ہے کہ کہاں سے کمائی زیادہ ہو اور وہ ہیں غیر علماء بعض عوام۔

اور مسلمانوں کا دوسرا (دینی) طبقہ دیکھئے جن کی دینی تعلیم کا مقصد نہ مادی اسباب کا حصول ہوتا ہے نہ اچھی ملازمت نہ عیش وعشرت بل کہ وہ زندگی میں قناعت کی روش اختیار کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا مقصد آخرت اور جنت اور رضاء الٰہی ہے اور وہ ہیں علماء کرام۔

ان دونوں طبقات کے مقاصد زندگی اور طرز زندگی کے فرق کو جاننے کے بعد آپ ہی فیصلہ کیجیے۔ کہ اگر دینی طبقہ کے مسلمانوں کی روش اور ان کا طرز زندگی بھی پہلے طبقے کے مانند ہو جیسا کہ آج کل حال ہے نہ صرف عام مسلمانوں کا بل کہ بعض علماء کا کہ حب دنیا اور حرص دولت نے آخرت سے ان کو ایسا غافل بنا دیا کہ ان (علماء وائمہ) کے زبانی کلمے اور جملے بھی بدل دیئے کہ خدمت دین کو ملازمت کہا جانے لگا اور زیادتیٔ وظیفہ پر قدیم جائے خدمت کو چھوڑا جانے لگا اور جب تک ایسی جگہ میسر نہ آئے اس جگہ کے منتظمین کو وظیفہ کی زیادتی کے لیے ہلکی سی دھمکیاں دی جانے لگیں کہ اگر تنخواہ نہیں بڑھائی تو ہم ملازمت چھوڑ دیں گے۔

یہ زبانی جملوں کی تبدیلی، جائے خدمت کی انتقالی، اور یہ دھمکیاں کس پر دلالت کرتی ہیں؟ سوچیے اور غور کیجیے۔

یقیناً آپ جس مشاہرہ اور معاوضے پر دینی خدمت کر رہے ہیں وہ صرف کم ہی نہیں بل کہ کچھ نہیں۔ وہ ترازو کی پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت کچھ ہے بل کہ سب کچھ بھی۔

کیوں کہ کم کا سوال تو اس وقت ہوتا جب کہ ہم روپیوں کی بنیاد پر پڑھاتے۔ وارثین انبیاء کے یہاں دنیا کی کمی وبیشی کوئی درجہ نہیں رکھتی پھر اس میں موازنہ کیسا؟ اور بہت کچھ اس لیے ہے کہ آپ قرآن شریف کی کوئی آیت کریمہ یا کوئی حدیث گرامی کا ایک جملہ کسی کو پڑھائیں گے اس کا عوض دنیا کے سارے خزانے بھی نہیں بن سکتے۔ کیوں کہ آپ نے جو پڑھایا اس کا اجر وثواب لایزال غیر فانی ہے اور جو خزانے آپ کو دیئے گئے وہ فانی زائل ہونے والے ہیں[1]۔

---

[1] تنخواہ اور وظیفے کے بارے میں مذکورہ بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم وارثین انبیاء علیہم السلام (علمائے عظام وائمہ کرام) کی قدر ومنزلت مٹا رہے ہیں یا گھٹا رہے ہیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ ان کے معاش کو

یہ تو اوقات کی اجرت ہے اور بس ''المجتمعُ المسلمُ یؤدِّی الی الائمۃِ الکرامِ رواتِبَہُمُ الشھرِیَۃَ اجرۃَ استخدامِ اوقاتِھم فحسبُ لان الامامۃَ بالمصلّین لایُمکنُ ان یُوزن ھذہ الخدمۃُ الجلیلۃُ بمیزَانِ الرواتبِ والوظائِفِ'' ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ کے منتظمین کو آپ کا خوب سے خوب تر لحاظ رکھنا چاہیے ورنہ خواہ مخواہ کی تنگی میں ڈالنے کی صورت میں وہ قیامت کے روز ماخوذ ہوں گے۔

ائمہ کو بہت سے جائز کام بھی چھوڑ دینے پڑتے ہیں

مقتدا اور غیر مقتدا کی زندگی میں نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ مطلب جو آدمی رتبہ میں جتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے اس قدر اس کی ذمہ داریاں اور پابندیاں بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا جو کام

صفحہ نمبر ۱۴۴ کا باقیہ حاشیہ۔۔۔۔۔۔

برباد کر کے ان کو بے حال بنایا جائے، نہیں یہ ان کی حقیقی اوصاف کی صرف ترجمانی ہے ورنہ منتظمین مساجد اور عام مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے امام کو معاش سے بے فکر کر کے اپنے سے بلند درجہ نہ سہی کم از کم اپنے درجے میں ضرور رکھیں ان کی تمام ضروریات کا اس طرح خیال رکھیں جس طرح اپنی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور ائمہ کو بھی چاہیے کہ معاش سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کی دینی ضروریات کے لیے سچی خیر خواہی کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

عجیب ماجرا ہے ! اگر بستی و آبادی کے سارے مسلمان مل کر اپنی مسجد کے ایک امام کو (اخراجات میں) اپنے ہی گھر کا ایک فرد تصور کر لیں تو کیا اس کی معاش کا کوئی مسئلہ باقی رہے؟ ہرگز نہ رہے۔ لیکن مسئلہ عمل کا ہے کون عمل کرے؟ اگر کوئی ایک دو محلے یا بستیاں عمل کر کے بتا دیں تو پھر ان شاء اللہ یہ چیز رواج پا جائے۔ امید کرتا ہوں کہ مفکرین حضرات اس کی کوئی بہتر صورت تجویز فرما کر ائمہ کی شکایت کا منھ بند فرمائیں گے۔ میں نے اپنے بس کا کام کیا اب اللہ سے امید کر رہا ہوں۔

عوام کے لیے درجۂ جواز کے ہیں بلند رتبہ شخص کے لیے ان میں سے بعض کو کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ گویا کسی کے حق میں صغیرہ دوسرے کے حق میں کبیرہ بن جاتا ہے "مُبَاحَاتُ العَوَامِّ سیأتُ الاَبْرَارِ وحسناتُ الابرارِ سیأٓتُ المقرّبِین"۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ منافقون کی تفسیر میں لکھا ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا چوں کہ نفاق ظاہر ہو چکا تھا جس کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کو قتل کرنے کی درخواست کی کہ اجازت ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درخواست کو قبول نہیں فرمایا۔

کیوں کہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ دشمن لوگ اپنوں میں یہ غلط فہمی پھیلا دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو قتل کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ ظاہر میں مسلمان تھا (جس سے دوسروں کے لیے اسلام میں داخلہ کا دروازہ بند ہو جاتا)۔

اس کے تحت حضرت نے لکھا ہے کہ اس واقعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ جو کام فی نفسہ جائز اور درست ہو مگر اس کے کرنے میں یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو کوئی غلط فہمی ہو گی یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا تو وہ کام نہیں کیا جائے گا (معارف القرآن۔ ۸/۴۵۶)۔

مؤطا مالک (رحمہ اللہ تعالیٰ) میں حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو حالت احرام میں رنگین کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو پوچھا طلحہ یہ کیا ہے؟ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا امیر المؤمنین یہ مٹی سے رنگا ہوا ہے (غالباً مطلب یہ ہے کہ یہ مٹی لگنے سے مٹی کا رنگ لگا ہوا ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ لوگوں کے امام ہیں لوگ آپ کی اقتداء کرتے ہیں جس سے لوگ بھی حالت احرام میں رنگین کپڑے پہننا شروع کر دیں گے، لہٰذا اس سے احتراز کیجیے (مؤطا ۱۲۶)۔

عہدے داروں کو اس کی ممانعت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی سی زندگی گزاریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے اس طرح کی پابندی اپنے عمّال پر لگا رکھی تھی کہ وہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہیں اور اپنی معیشت کا معیار بلند رکھیں۔ ''شَرَطَ عَلَیْھِمْ اَنْ لَّا تَرْکَبُوْا بِرْذُوْنًا وَلَا تَأْکُلُوْا نَقِیًّا وَلَا تَلْبَسُوْا رَقِیْقًا وَلَا تُغْلِقُوْا اَبْوَابًا دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ''۔ (مشکوٰۃ ۳۲۴)۔ تم اپنی سواری کے لیے ترکی گھوڑا نہ رکھنا۔ میدے کی روٹی نہ کھانا، باریک کپڑے نہ پہننا اور اپنی ضرورت لے کر آنے والوں (عوام) کے لیے دروازہ بند نہ رکھنا ورنہ تم سزا پاؤ گے۔ اوپر کی دونوں روایتیں علماء وائمہ کے لیے بڑی عبرت کا سامان پیش کر رہی ہیں۔

لہٰذا ائمہ وعلماء حضرات کو بھی جو کام فی نفسہ جائز ہوں ان کو اس وقت چھوڑ دینے چاہیے جب کہ ان کے کرنے سے کسی خرابی یا غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا چبوتروں پر بیٹھنے سے، غیر صالح کی صحبت سے (مگر یہ کہ اصلاح کی غرض ہو)، غیر ضروری گفتگو سے پرُتعیش رہن سہن سے، مباح جلوس میں شرکت سے اور موبائیل کے غیر ضروری استعمال وغیرہ سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے۔

ائمہ کی زندگی سفید لباس کی طرح ہے

ائمہ حضرات کا مقام ومرتبہ ہر خاص وعام میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ائمہ حضرات کو اپنے منصب ومقام کا خود بھی پاس ولحاظ رکھنا چاہیے۔ ان کی زندگی سفید لباس کی طرح ہے کہ اس پر کوئی بھی دھبہ فوراً نظر آجاتا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں بطور خاص مال ودولت کے بارے میں علماء وائمہ حضرات کا کیا رویہ ہونا چاہیے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''ہم علماء کی زندگی عوام سے مال ودولت کے سلسلہ میں بالکل ممتاز ہونی چاہیے، دیکھنے والا کھلی آنکھوں

دیکھ لے کہ ہم دنیا کے طالب نہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں۔ جب تک ہمارے طبقہ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی۔

علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا، وہاں اتنے طلبہ پڑھتے ہیں، اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں اس سے علماء کا وقار قائم نہیں ہوگا۔ علماء کا وقار قائم ہوگا ذاتی نمونہ سے۔ عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز (مال و دولت) ایسی ہے کہ اس پر جان دیدی جائے لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں وہ اس کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، تب علماء کا ایک مقام اللہ تعالیٰ عوام میں پیدا فرماتے ہیں (تحفۃ الائمہ/۷۷)۔

لہٰذا ائمہ حضرات اپنی ضروریات زندگی میں ایسا طرز اختیار کریں کہ کوئی بھی تہمت وشبہ باقی نہ رہے۔ مثلاً سواری، مکان اور کپڑے وغیرہ میں اپنی آمدنی کے تناسب سے اپنی سواری اپنا مکان وغیرہ بسائیں، آمدنی سے بڑھ کر نہ بسائیں۔ جس سے لوگ خواہ مخواہ مغالطوں اور شکوک کے شکار ہوں اور پھر آپ حضرات لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ چاہے لوگ آپ سے کہیں یا نہ کہیں سمجھتے ضرور ہیں کہ کیا ہو رہا ہے!!!

حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بڑے عارف گزرے ہیں آپ نے فرمایا: دس درویش ایک کمبل میں سما سکتے ہیں مگر دو بادشاہ پورے ملک میں نہیں سما سکتے!! درویش سے پوچھیں تو کہے گا کہ یہ کمبل بہت بڑا ہے دس اور بھی آجائیں تو بھی اس میں سما جائیں گے۔ اور بادشاہ سے پوچھیں گے تو وہ کہے گا کہ یہ ملک تو بہت ہی چھوٹا ہے ایسی ہزاروں دنیا اور بھی پیدا ہو جائیں تو وہ بھی کم ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل بات لوگوں کی ہوس اور قناعت کی ہے۔

جب تک حب دنیا کو مٹایا نہیں جائے گا وہاں تک اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا کوئی مقام ہی نہ ہوگا۔ حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل صدقات میں لکھا ہے کہ دنیا سے محبت رکھنے

والا اگرچہ آخرت کے اعمال کرتا ہو، لیکن اس ناپاک دنیا کی محبت رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔۔۔
جو شخص دنیا کو محبوب رکھتا ہے سارے پیر و مرشد مل کر بھی اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ اور جو شخص دنیا کو ترک کر دیتا ہے اس کو سارے مفسدین مل کر بھی گمراہ نہیں کر سکتے۔ (فضائل صدقات ۴۲۱)۔

اسی حب دنیا کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب نے ایمان پیش کرنے کے معاملہ میں کہا تھا۔ ''اِخْتَرْتُ النَّارَ عَلَی الْعَارِ'' کہ قوم کی نگاہ میں ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہاں جہنم کی آگ برداشت کر سکتا ہوں۔ العیاذ باللہ۔۔

لہٰذا ائمہ حضرات قناعت کو اپنا شیوہ بنائیں اور جو ضرورت درپیش ہو اس کا سوال صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں، لوگوں سے اپنی ضرورت کا اظہار مہذب انداز میں بھی نہ کریں۔
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنی تمام ضرورتوں کا سوال اپنے رب سے کرے حتی کہ اپنے جوتے کے تسمہ کے ٹوٹنے پر تسمہ کا سوال بھی (صرف اللہ سے کرے) (مشکوٰۃ/۱۹۶)۔

حضرت ابو علی دقاق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات معرفت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اپنی حاجت، خواہ وہ بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی صرف اللہ سے مانگی جائے۔ پھر انہوں نے بڑی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کے دیدار کے مشتاق ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں سب سے بڑی اور سب سے عظیم الشان درخواست یہ پیش کی ''رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ '' اے میرے رب مجھے دکھا کہ میں تیری طرف یعنی تجھے دیکھوں۔ دوسری طرف وہ نانِ جویں کے بھی محتاج ہوئے تو پروردگار ہی سے عرض کیا ''رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ '' میرے پروردگار تو نے میری طرف از قسم مال و رزق جو کچھ اتارا ہے میں اس کا محتاج ہوں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بیعت کے لیے بلایا اور

وہ اس بات پر تھی کہ تم، لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہیں کروگے۔ میں نے منظور کرلیا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تمہارا اپنے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جائے تم نیچے اتر کر خود اٹھاؤ گے۔ (مشکوٰۃ ر ۱۶۴)۔ حالاں کہ کوڑا اٹھوانا سوال میں سے نہیں کیوں کہ سوال تو دوسرے کے مال سے ہوتا ہے، جب کہ کوڑا تو خود کا ہے پھر بھی مبالغۃً کوڑا دوسرے سے اٹھوانے سے بھی منع فرمایا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرفہ کے دن ایک آدمی کو لوگوں سے سوال کرتے سنا تو آپ نے یہ کہہ کر درہ سے خبر لی کہ اس دن اور اس جگہ (میدان عرفہ میں) غیر اللہ سے سوال کرتا ہے (مشکوٰۃ ۱۶۳)۔ یعنی اس مقدس دن اور مقدس جگہ میں جب کہ دو دو شرف جمع ہیں غیر اللہ سے سوال کرتا ہے اللہ سے مانگنا چاہیے نہ کہ لوگوں سے۔

ان احادیث وغیرہ کو نقل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم خود بھی لوگوں سے مستغنی ہوں اور قناعت کو اختیار کریں اور اپنے مقتدیوں کو بھی استغناء کی خوب تعلیم دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامل طور پر مستغنی بنائیں۔ آمین۔

ائمہ مضر بے تکلفی سے اپنے کو خوب بچائیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے ہر کام میں افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال ومیانہ روی کی خوب تعلیم دی ہے۔

احادیث کی کتابوں میں باقاعدہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے "بَابُ الْقَصْدِ فِي الْعَمَلِ" کے تحت ایسی احادیث جمع کی ہیں جن سے دینی بل کہ دنیوی کام میں بھی درمیانی اور متوسط طریقہ کیا ہو معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً قرآن شریف میں آواز پست کرنے، اکڑ کر نہ چلنے اور نگاہ کو نیچی رکھنے کے جو

احکام ہیں وہ بھی اسی قبیل سے ہیں "وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا" ۔ "وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ" (سورۃ لقمان ۱۹)۔لہٰذا بیوی بچوں پر خرچ (مثلاً کپڑوں اور کھانوں اور رہن سہن وغیرہ کے تمام امور) میں اعتدال اختیار کرنا چاہیے۔

اسی طرح بطور خاص ہم ائمہ کو دوسروں کے ساتھ تعلقات اختیار کرنے میں بھی اعتدال کی راہ اپنانی چاہیے کیوں کہ حد سے زیادہ بے تکلفی سے نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہے پھر آپ اس کی نظر میں دشمن بن جائیں گے۔

حضرت طاہر بن حسین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن طاہر رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب وہ گورنر بنائے گیے تو کچھ وصیتیں فرمائی۔ان میں سے ایک یہ میانہ روی بھی ہے۔" وَعَلَیْكَ بِالْاَقْتِصَادِ فِی الْاُمُوْرِ كُلِّهَا. فَلَیْسَ شَئٌ اَبْیَنَ نَفْعًا. وَلَا اَخَصَّ اَمْنًا. وَلَا اَجْمَعَ فَضْلًا مِنْهُ " (القراءۃ الرشیدہ ۴/۶۱)۔

علماء ومصنفین نے نہ صرف اپنی ذات کا بل کہ اپنے علمی اور تصنیفی مقام کا بھی بہت لحاظ کیا ہے کہ کوئی بھی نقل وحرکت اور قول وفعل ایسا اختیار نہیں فرمایا جس سے اپنا علمی مقام یا تصنیفی کارنامہ متأثر ہو۔امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کے احوال اس پر شاہد ہیں۔لہٰذا ائمہ حضرات کو بھی اپنے منصب امامت کا خیال رکھتے ہوئے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو منصب کے خلاف ہو۔

حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا:

(۱) اے احنف جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہوجاتا ہے۔

(۲) جو زیادہ مذاق کرتا ہے تو لوگ اسے ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔

(۳) جو باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہوجاتی ہیں۔
(۴) جس کی لغزشیں زیادہ ہوجاتی ہیں اس کی حیا کم ہوجاتی ہے
(۵) جس کی حیا کم ہوجاتی ہے اس کی پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے
(٦) جس کی پرہیزگاری کم ہوجاتی ہے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے۔

تعلقات کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالی کا ایک زریں جملہ نقل کیا جاتا ہے اس کو یاد رکھئے ان شاء اللہ بہت کام دے گا جو اسی اعتدالی صفت پر مبنی ہے۔فرمایا " اَلْاِنقِباضُ عنِ الناسِ مَکْسَبَۃٌ لِلْعَداوَۃِ. وَالْاِنْبِسَاطُ اِلَیْھِمْ مَجْلَبَۃٌ لِقُرَناءِ السُّوْءِ، فَکُنْ بَیْنَ الْمُنْقَبِضِ وَ الْمُنْبَسِطِ " (حلیۃ الاولیاء ۹/ ۱۳۰)۔

ترجمہ: لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا لوگوں کو دشمن بنادیتا ہے۔ بہت زیادہ خندہ پیشانی سے ملتے رہنا برے ہم نشینوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لہٰذا ترش روئی اور خندہ پیشانی کے درمیان راہ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حد اعتدال سے رہنا سکھائیں۔آمین۔

اپنے اسلاف کی اتباع نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا قوی ستون ہے

علماء کرام انبیاء علیہم السلام کے وارث اسی لیے قرار دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے ماتحت افراد کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اپنی پوری جدوجہد سے اس طرح دین پر جمائے رکھیں جس طرح ایک نبی اپنی زندگی میں اپنی امت کو پوری جدوجہد سے قائم رکھتا اور جمائے رکھتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ میں کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا تھا وہ اسی مقصد سے تھا۔اس طرح کی نیابت اور دین پر جمائے رکھنے سے ایک مقصد ان کو اصل دین پر باقی رکھنا ہوتا ہے کہ اصل دین کوئی دوسری صورت اختیار نہ کرجائے۔

اور یہ اس صورت میں حاصل ہوگا جب بعد کے حضرات نبی کے متبعینِ اول وثانی (اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ) کے واسطے سے نبی سے وابستہ ہوں۔ کیوں کہ اگر اپنے اسلافؒ کے ساتھ وابستگی نہ رہے تو سبقاً سبقاً دین اپنی اصلی حالت سے ہٹ کر دوسری شکل اختیار کر جائے۔ اس تفصیل سے اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی اتباع کا بے انتہا ضروری ہونا معلوم ہوگیا۔ اس کو ایک حدیث شریف کی روشنی سے سمجھئے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "قَالَ رَاٰی رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ فِیۡ اَصۡحَابِہٖ تَأَخُّرًا فَقَالَ لَھُمۡ تَقَدَّمُوۡا وَأۡتَمُّوۡابِیۡ وَلِیَأۡتَمَّ بِکُمۡ مَنۡ بَعۡدَکُمۡ" (مشکوٰۃ ۹۸)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو (نماز کی صف یا حصول علم میں) پیچھے رہتے دیکھا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آگے بڑھو اور میری اقتداء کرو کیوں کہ تمہارے بعد والے تمہاری اقتداء کریں گے۔ میری اقتداء کرو کا مطلب یہ ہے کہ جیسا میں کروں ویسا تم بھی کرو۔

اس اتباع کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ بعد میں آنے والے لوگ ایسا ہی عمل اختیار کریں گے جیسا انہوں نے اپنے سے پہلے والوں کو کرتے دیکھا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ بعد والوں کے درست اعمال کا مدار اسلافؒ کے اعمال پر ہے اور اسلافؒ کے اعمال کو اختیار کرنے کا مدار (جو رابط ہے) ان کی اتباع پر ہے۔ اگر یہ اتباع فوت ہوجائے تو درست عمل بھی فوت ہوجائے گا اور نادرست عمل اس کی جگہ لے لیگا۔

اسی پر بس نہیں کہ عملی خرابی پیدا ہوجائے گی بل کہ نظری (علمی) خرابی بھی پیدا ہوجائے گی۔ یعنی عملی اور علمی دونوں خرابیاں پیدا ہوجائیں گی۔ پھر امت کی گمراہی کا دروازہ کھل جائے گا۔

تَنَبُّہ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ اتباع اسلافؒ کا مدار عوام نہیں بل کہ ان کے علماء ہیں جس طرح اصطلاح فقہ کے ''اجماعِ امت'' کا تعلق علماء سے ہے نہ کہ عوام سے۔ کیوں کہ عوام تو خود اپنے علماء کے تابع ہیں، وہ زندگی میں کسی عمل میں مستقل ومنفرد نہیں۔ عوام کے اعمال کی میزان۔۔۔ علماء کے اعمال ہیں۔۔۔ جس طرح علماء کے اعمال کی میزان۔۔۔ اسلافؒ کے اعمال ہیں۔۔۔ لہٰذا ائمہ حضرات اپنے ہر قول وفعل میں پھونک پھونک کر قدم رکھیں کوئی بھی قدم بے سوچے سمجھے اور بے فکری سے نہ رکھیں۔ ورنہ اتباع سلف چھوٹنے پر امت کی گمراہی کے دروازے کھل جائیں گے۔

اس کی مثال حضرت سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کی قوموں کا حال ہے۔
حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک جتنی قومیں آئیں وہ سب مومن تھیں اور ان کے پاس جو انبیاء تشریف لائے وہ دین وایمان اور اعمال بد سے اعمال صالحہ کی طرف دعوت دینے کے لیے تشریف لائے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کفر وبت پرستی شروع ہوئی، شیطان نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بت پرستی شروع کروائی۔۔۔

اس طرح کہ ایک نسل کو تو اپنے بزرگوں کی تصویریں بنا کر ذہنی تعظیم خوب کرائی'' صَوَّرُوْا الصَّالِحِیْنَ وَعَظَّمُوْھَا ''۔۔۔ پھر دوسری نسل کو ان بزرگوں کے مرنے کے بعد ان کے مجسمے بنوا کر ان کے پاس ٹھہر کر دعائیں اور مرادیں منگوائیں اور ان کے پاس سجدے کرائے، لیکن یہ دعائیں اور سجدے مجسموں کے لیے نہیں بل کہ صرف اللہ کے لیے ہوتے ''مِنَ الصُّوَرِ اِلَی التَّمَاثِیْلِ''۔۔۔ پھر تیسری نسل کو بت بنوا کر ان کی عبادت میں لگوایا'' مِنَ التَّمَاثِیْلِ اِلَی الْاَصْنَامِ ''۔۔۔ اس طرح بتدریج شرک کی راہیں کھول دیں۔ اس نتیجہ اور اس کے اسباب پر غور کریں تو معلوم یہی ہوگا کہ اس کی وجہ اپنے اسلاف کی اتباع سے ان کے قدم کا ہٹنا اور اپنی سوچ

پر چلنا تھا جس کی وجہ سے بعد کی نسل کو اصل دین نہ پہنچ سکا،

لہٰذا ہم ائمہ حضرات کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عمل کو پشت در پشت درست درست پہنچائیں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مذہب کا پیشوا بن کر لوگوں کو مذہب کی دولت نہ دے سکے۔!!! مذکورہ مضمون کو صاحب مرقاتؒ نے مذکورہ حدیث کے تحت اس عنوان سے پیش کیا ہے "اِتِّبَاعُ السَّلَفِ مَامُوْرٌبِہٖ" (مرقات ۳/۷۰)۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعد والوں کے لیے خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے سلف صالحین کا اتباع کریں۔ جب آدمی اس سے آزاد ہو جاتا ہے تو شیطان اس کو آسانی سے کسی گمراہی اور فتنہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے سلف صالحین کا دامن مضبوطی سے تھام لیا وہ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ خاص کر ہمارے اس زمانہ میں جب کہ آزاد خیالی کی وبا عام ہے اور بہت سے لوگ صرف اردو رسالے پڑھ پڑھ کر دین کے بارے میں بالکل مجتہدانہ بل کہ آزادانہ طور پر غور کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھنے لگتے ہیں تو اس وقت تو ہمیشہ سے زیادہ اتباع سلف کے اصول پر مضبوطی سے جمنے کی اور دوسروں کو جمانے کی ضرورت ہے (دین وشریعت ۱۲۵)۔ کسی عمل سے غفلت وسستی اتنا بڑا جرم نہیں جتنا اپنے نبی واسلاف کی اتباع سے انحراف کرنا جرم ہے کیوں کہ اس میں اصل دین کی متاع فوت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم ائمہ حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ عوام الناس کو اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کی ذمہ داری کو محسوس فرمائیں اور اس کی خوب کوشش کریں۔

خلافِ شرع عقل کی اتباع گمراہی ہے

ایک بات اسی مناسبت سے اور جانتے چلیں کہ یہ اتباع نبوی یا اتباع سلف امر تعبدی (خلاف عقل معاملہ) میں زیادہ واضح ہوتی ہے بنسبت غیر تعبدی کے۔ مثلاً:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ''لَوۡ کَانَ الدِّیۡنُ بِالرَّاۡیِ لَکَانَ اَسۡفَلُ الۡخُفِّ اَوۡلٰی بِالۡمَسۡحِ مِنۡ اَعۡلَاہُ وَقَدۡ رَاَیۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَمۡسَحُ عَلٰی ظَاھِرِ خُفَّیۡہِ'' (مشکوٰۃ ۵۴)۔ اگر دین کا مدار عقل ورائے پر ہوتا تو مسح میں موزے کا نچلا حصہ بنسبت اوپر کے حصہ کے اولی اور بہتر ہوتا (کیوں کہ نچلا حصہ زیادہ گندہ ہوتا ہے بنسبت اوپر والے حصہ کے) لیکن میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موزے کے اوپر کے حصہ میں مسح کرتے دیکھا ہے۔

(۲) **حضرت امام اعظم ابوحنیفہ (نعمان بن ثابت کوفی)** رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اگر میں عقل ورائے پر عمل کا قائل ہوتا تو پیشاب کرنے سے وجوبِ غسل اور خروج منی سے وجوبِ وضو کا قائل ہوتا۔ کیوں کہ پیشاب باتفاق فقہاء نجس اور ناپاک ہے جب کہ منی مختلف فیہ۔

اور مسئلہ وراثت میں مرد کو عورت کے حصہ کا نصف حصہ دیتا کیوں کہ عورت اکتساب اموال میں مرد کے بنسبت کمزور ہے جس سے وہ مستحق زیادتی ہے۔ لیکن چوں کہ دین اسلام کا مدار اپنی عقل وسوچ پر نہیں بل کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو ثابت ہو اس پر ہے، اس لیے میں اس کا قائل نہیں۔

'' قَدۡ قَالَ اَبُوۡ حَنِیۡفَۃَ لَوۡ قُلۡتُ بِالرَّاۡیِ لَاَوۡجَبۡتُ الۡغُسۡلَ بِالۡبُوۡلِ لِاَنَّہٗ نَجَسٌ مُّتَّفَقٌ عَلَیۡہِ ، وَالۡوُضُوۡءَ بِالۡمَنِیِّ لِاَنَّہٗ مُخۡتَلَفٌ فِیۡہِ وَلَاَعۡطَیۡتُ الذَّکَرَ فِی الۡاِرۡثِ نِصۡفَ الۡاُنۡثٰی لِکَوۡنِہَا اَضۡعَفَ مِنۡہُ'' (مرقات ۲/۸۵)۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور ارشاد حجر اسود کی تقبیل کے بارے میں کہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک ایسا پتھر ہے جو نہ تو نفع پہونچا سکتا ہے نہ نقصان، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرا بوسہ لیتے نہ دیکھتا تو میں تیرا بوسہ نہ لیتا (مشکوٰۃ ۲۲۸)۔ یعنی یہ تقبیل اس حد تک تو درست ہے کہ اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور آپ کے حکم کی تعمیل ہے جو باعث اجر وثواب ہے۔ ورنہ نفس پتھر ہونے کے ناتے اس لائق نہیں کہ اس کی تقبیل کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں اور اپنے ماتحت افراد کو دینی جملہ امور میں اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نقش قدم کولازم پکڑنا چاہیے۔ چاہے وہ نظریات وعقائد ہوں یا اعمال۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلاف کی کامل اتباع کی مضبوط زنجیروں میں رکھیں ان سے بال کے برابر آزادی سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

(۱۰) امام ومؤذن کی صفات (فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ)

امامت کے لحاظ سے امام کی ذمہ داری کو ہم ان شاء اللہ جزء چہارم میں بیان کریں گے البتہ کچھ ضروری اور اجمالی باتیں جو فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں انہیں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اختصار کی وجہ سے ان کو یاد رکھ کر عمل میں لایا جاسکیں۔

فقیہ ابواللیثؒ فرماتے ہیں کہ اذان کے فضائل حاصل کرنے کے لیے مؤذن کے اندر دس صفات ہونی چاہیے۔

(۱) مؤذن نماز کے اوقات سے واقف ہو۔ تاکہ صحیح وقت پر اذان پکار سکے۔

(۲) آواز کی اور گلے کی حفاظت کرے۔ تاکہ اچھی اذان ہو اور دور تک آواز جاسکے۔

(۳) اپنی غیر موجودگی میں کسی دوسرے کے اذان پکارنے پر خفا نہ ہو۔ یہ بداخلاقی ہے۔

(۴) اذان عمدہ طریقہ پر دینا جانتا ہو۔ یعنی خوش الحانی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ساتھ دینا جانتا ہو۔

(۵) ثواب کی نیت سے اذان دیتا ہو۔ وظیفہ یا دوسروں پر بڑائی جتانے کے لیے نہیں۔

(۶) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو۔

(۷) امام کا انتظار اتنا کرتا ہو کہ نمازیوں کو ناگوار نہ ہو۔ اور امام کو بھی چاہیے کہ خواہ مخواہ انتظار نہ کروائے۔

(۸) مسجد میں اس کی جگہ کوئی اور بیٹھ جائے تو ناراض نہ ہو۔ مؤذن کے لیے کوئی جگہ متعین نہیں ہے دائیں بائیں کہیں سے بھی اذان (اقامت) دے سکتا ہے۔

(۹) اذان ونماز کے درمیان لمبی نمازیں نہ پڑھے کہ لوگوں کو اس کا انتظار کرنا پڑے۔

(۱۰) مسجد کی صفائی کا خیال رکھے۔ یہ مؤذن کے فرائض میں سے ہے[۱]۔

(روضۃ الصالحین ۳/ ۱۷۵)

---

[۱] اس کے ساتھ کچھ ضروری چیزیں بھی ملاحظہ ہوں۔

چوں کہ تاذین، امامت کا ایک ضمنی منصب ہے لہٰذا اذان کی صحت وغیرہ کی ذمہ داری بھی امام پر ہے نیز اذان ایک اسلامی شعار ہے جس پر بستی کی صلاح وخرابی اور غضب الٰہی سے امن موقوف ہے، لہٰذا ائمہ حضرات کو چاہیے کہ اپنی اپنی مسجدوں میں صحیح اذان دلوانے کی پوری کوشش کریں۔

(۱) باوضوء اذان پکارنے کا اہتمام کرے تاکہ اس کا ثواب بھی حاصل ہو۔

(۲) اذان پکارنے سے پہلے دل میں (بسم اللہ الرحمن الرحیم) پڑھ لے۔

(۳) اذان پکارنے کو عبادت خیال کرے۔ بل کہ دعوت الی اللہ خیال کرے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلا رہا ہے

(۴) جب اذان باوضوء ایک عبادت اور دعوت الی اللہ ہے تو نابالغ بچوں سے اور کم عقل اور ایسے معذورین سے دلوانے سے پرہیز کرے کہ جن کو معاشرہ میں حقیر سمجھا جاتا ہو۔

(۵) اللہ اکبر کے شروع کے ہمزہ (الف) میں مد نہ کرے ورنہ معنی بدل جائے گا۔ اور اذان کو خواہ مخواہ کھینچ کھینچ کر نہ پکارے۔ صرف لفظ اللہ کے لام پر اور ہر آخری کلمہ پر (سوا اکبر) مد کی وجہ سے کھینچے لیکن وہ بھی بقدر مد اصلی۔

(۶) بہتر یہ ہے کہ مؤذن کلمات اذان کو ان کے معانی سمجھ کر اذان دے اور دوران اذان ان معانی کا خیال بھی دل میں لائے۔

(۷) اذان درمیانی رفتار سے پکارے۔ نہ جلدی جلدی پکارے نہ طویل وقفہ سے۔

(۸) حی علی الصلوٰۃ والفلاح میں دائیں بائیں صرف اپنا چہرہ گھمائے۔ سینہ نہ گھمائے۔

(۹) ختم اذان کی دعا پڑھ لے۔

(۱۰) اقامت (تکبیر) سنت کے مطابق کہے اور جلدی سے کہے۔

ان مذکورہ چیزوں پر خود مؤذن کا دھیان دینا اور اگر وہ غلطی کر رہا ہو تو امام کا اپنے مؤذن کو دھیان دلانا اور سکھانا اور عمل کرانا ضروری ہے۔ اور یہ اس کے لیے باعث اجر وثواب عمل بھی۔ لہٰذا ان چیزوں کے پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے بعد کے احوال میں فرق ہو سب ہی اس فرق کو محسوس کریں کہ واقع میں اصلاح کا فرق ہوا۔ اسی کو تعلیم وتربیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ راہ عمل آسان فرمائیں۔ ”اِنۡ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِلَّا فَمِنِّیۡ وَمِنَ الشَّیۡطَانِ“

اس طرح امام کے لیے دس صفات ضروری ہیں۔

تا کہ اس کی اور قوم کی نماز کامل ہو

(۱) قرآن پاک کو تجوید کے ساتھ صحیح پڑھتا ہو اور مسائل سے واقف ہو۔ اس کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی اور بعض مرتبہ ہوتی ہی نہیں۔

(۲) تکبیرات انتقالیہ ٹھیک سے کہتا ہو۔ تا کہ لوگ سن بھی لیں کسی کو شبہ نہ ہو۔

(۳) رکوع، سجدہ ٹھیک سے ادا کرتا ہو۔ ورنہ نماز ناقص ہوگی۔

(۴) حرام و مشتبہ چیزوں سے احتیاط کرتا ہو۔ امامت کھیل نہیں عظیم عہدہ ہے۔

(۵) جسم اور کپڑوں کو صاف رکھتا ہو۔ تا کہ مقتدیوں کو کراہت نہ ہو۔

(۶) قوم کی مرضی کے بغیر قراءت کو طویل نہ کرے۔ اتنا طویل کے جس سے پریشانی ہو۔ سنت کے مطابق پڑھے۔

(۷) اپنی امامت پر غرور نہ کرتا ہو۔ غرور کا موقع ہی کہاں ہے۔

(۸) نماز شروع کرنے سے پہلے استغفار کر لے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ امام پہلے سے تیار ہو۔ بھاگ دوڑ میں بہت مشکل ہے۔

(۹) سلام پھیرتے وقت دوسروں کی (سلام کی) نیت کرے۔ داہنی اور بائیں دونوں جانبوں کے وقت۔

(۱۰) اگر مسجد میں کوئی غریب مسافر آجائے تو اس کی خبر گیری کرے کہ یہ امام کی ذمہ داری [۱] ہے (روضۃ الصالحین ۱۷۶/۳)۔

---

[۱] اس کے ساتھ درج ذیل چیزوں کا بھی لحاظ رکھے باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عالم کی صفات

چوں کہ ائمہ حضرات عالم بھی ہیں اس لیے درج ذیل صفات بھی ان میں ہونا ضروری ہیں۔ بزبان فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(۱) اخلاص: اس کے بغیر علم وعمل بے کار ہیں۔جس عمل میں اخلاص نہیں اس کا ثواب نہیں۔

باقی حاشیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۱) تکبیرات انتقالیہ کہنے میں نہ انتقال سے بہت پہلے کہے نہ پورے انتقال کے بعد۔ آج کل یہ خامی بہت پائی جاتی ہے،سنت کو ملحوظ رکھے۔

(۲) امام جہری نماز میں قراءت اتنی زور سے نہ پڑھے کہ رگیں ابھر آئیں اور سانس تنگ ہوجائے یہ بھی خشوع کے خلاف ہے۔

(۳) سری نمازوں میں قراءت پڑھنے میں کم ازکم ہونٹوں کو پورے طور پر حرکت دے اس طرح کہ ہونٹوں کی پھسپھساہٹ سنائی دے۔ورنہ قراءت نہ ہوگی اور اگر قراءت نہ ہوگی تو نماز بھی نہ ہوگی۔

(۴) مائک (آلہ مکبر الصوت) کا استعمال کرے تو بہت تیز آواز نہ رکھے یہ بھی نماز کی شان کے خلاف ہے ۔اور اگر نماز کے درمیان گر جائے تو پھر عمل قلیل سے لگالے ورنہ آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے دوسروں کی نماز خراب ہوگی۔آج کل اکثر مسجدوں میں اس کو استعمال کیا جارہا ہے باوجودیکہ نمازی بہت تھوڑے اور مسجد بہت چھوٹی ہوتی ہے یہ خلاف سنت ہے۔ ضرورت شدیدہ کے بغیر استعمال نامناسب ہے۔

(۵) نماز شروع کرتے وقت تکبیر تحریمہ بہت دھیان سے کہے عجلت میں نہ کہے۔کیوں کہ نماز کا انعقاد اسی سے ہے جیسی تکبیر ہوگی ویسی پوری نماز ہوگی۔اسی لیے روایت میں ہے کہ ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے نماز کا خلاصہ تکبیر تحریمہ ہے۔

(۶) سنت ونوافل مسجد میں پڑھتے وقت تمام سنن وآداب کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھے۔کیوں کہ عوام مسائل پوچھ کر نماز نہیں پڑھتے بل کہ پڑھنے والوں کو دیکھ کر پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔

(۷) ایک ہے نماز پڑھنا اور ایک ہے نماز کو بنانا۔نماز تو ایک مدت سے پڑھتے چلے آرہے ہیں اب آگے بڑھ کر نماز بنانے کے درجہ پر پہنچیں۔خود بھی نماز بنائیں اور مقتدیوں کو بھی کہیں کہ وہ بھی اب نماز بنانے پر آئیں۔ ”اِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللہِ تَعالیٰ وَاِلَّا فَمِنِّی وَمِنَ الشَّیْطَانِ“

(۲) **خوف خدا** : یہ اخلاص وعمل کی بنیاد ہے۔

(۳)**نصیحت** : یہ علم کا مقصد ہے کہ آدمی اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں سے بھی کرائے۔

(۴) **شفقت** : یہ نصیحت ودعوت کی بنیاد ہے۔شفقت ہی کہ وجہ سے آدمی دوسروں کو نیک بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۵) **صبر وبردباری** : دعوت وتبلیغ میں ناگوار اور تکلیف دہ باتیں پیش آتی ہیں ان پر صبر ضروری ہے ورنہ تبلیغ ممکن ہی نہیں۔

(٦) **تواضع**: یہ علم کی شان ہے۔صحیح علم تواضع سکھاتا ہے یہ اللہ کو بھی پسند ہے اور بندوں کو بھی۔

(۷) **عفت**: (پاک دامنی) یہ ہر انسان کا زیور ہے خصوصًا عالم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وعظ ونصیحت بے اثر ہوجائیں گے۔

(۸) **مطالعہ**: کتب بینی سے علم بڑھتا ہے اور محفوظ رہتا ہے۔یہ ہر عالم کے لیے بہت ضروری ہے۔

(۹) **افادہ** : (فائدہ پہنچانا) عالم کے لیے جس طرح خود عمل کرنا ضروری ہے اس طرح دوسروں کو نصیحت کرنا اور مسائل بتانا بھی ضروری ہے۔

(۱۰) **قلت حجاب** : علم حاصل کرنے میں شرم جائز نہیں بل کہ محرومی کا سبب ہے۔علم سوالوں سے بڑھتا ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" ترجمہ : اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے دریافت کرلو (روضۃ ۳/۳٦)۔

ہر عالم کے پاس نہ بیٹھو

کسی بزرگ نے فرمایا ہر عالم کے پاس نہ بیٹھو بل کہ اس عالم کے پاس بیٹھو جو پانچ باتوں سے پانچ کی طرف بلائے۔ (۱) شک سے یقین کی طرف۔ (۲) تکبر سے تواضع کی

طرف۔ (۳) بغض وعداوت سے محبت ورغبت کی طرف۔ (۴) ریاکاری سے اخلاص کی طرف۔ (۵) دنیا کی محبت ورغبت سے زہد کی طرف۔ بعض نے اس قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دنیادار عالم

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عالم اگر دنیا کی طرف راغب اور اس کا حریص ہوتا ہے تو اس کی صحبت، جاہل کی جہالت، فاسق کے فسق کو بڑھاتی ہے اور ان کے دلوں کو سخت کرتی ہے۔

علم کے مراتب

فقیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں علم کا ابتدائی حصہ خاموشی، دوسرا غور وفکر، تیسرا حفظ، چوتھا عمل، پانچواں تبلیغ ہے۔ اسی طرح علماء کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ عالم باللہ وبامر اللہ۔ جو حدود وفرائض سے واقف ہو اور خوف خدا کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو۔

۲۔ عالم باللہ لا بامر اللہ۔ جو خدا سے ڈرتا ہو اور عمل کرتا ہو لیکن مسائل سے زیادہ واقف نہ ہو۔

۳۔ عالم بامر اللہ لا باللہ۔ جو مسائل سے تو خوب واقف ہو لیکن اس کے اندر اللہ کا خوف نہ ہو۔

(روضۃ الصالحین۔ ۳/۳۶)۔

تَنَبُّه: عالم باللہ کا مطلب جیسے بتایا خدا کا خوف رکھنے والا لیکن وہ ایک باطنی چیز ہے۔ جس کو بالفاظ دیگر کہیں کہ رب العالمین کے جلال وجمال کا مظہر ہو۔

ان قسموں کے علماء میں فرق اس طرح بھی ہے۔

تیسری قسم کے علماء سے صرف مسائل پوچھے جائیں لیکن ان کی مجلس میں بیٹھا نہ جائے۔دوسری قسم سے مسائل نہ پوچھے جائیں ہاں ان کے پاس بیٹھا جائے۔اور پہلی قسم سے جو مسائل ومصادر دونوں سے واقف ہیں بطور خاص ان سے مسائل پوچھے بھی جائیں اور ان کے پاس بیٹھا بھی جائیں (توضیحات شرح مشکوۃ ١/٤٥١)۔

اصل مقصود دین ہے، نہ کہ ذریعہ

آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک عبادت بالواسطہ ہوتی ہے اور دوسری بلاواسطہ۔آج بالواسطہ عبادت کا رواج ہوگیا ہے اور بلاواسطہ کا کم۔ضرورت ہے کہ اس کو بڑھایا جائے ۔اور اگر بالواسطہ عبادت میں نفس دین بھی چھوٹ رہا ہوتو کس قدر ناسمجھی اور غفلت کی بات ہوگی !! کیوں کہ آدمی دینی جو کام کرتا ہے اس میں وہ اس کے لیے بہت سے ذرائع بھی عمل میں لاتا ہے۔ لیکن وہ اس ذریعہ کے استعمال کو دین سمجھ بیٹھتا ہے اور اس استعمال ذریعہ میں نفسِ دین (امر الٰہی) کو بھی چھوڑ دیتا ہے!!!

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مساجد و مدارس یا سیاست وغیرہ دین کا ذریعہ ہیں ۔لہٰذا ذریعہ کی حفاظت پر مقصود کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔کون سا کام کس وقت کرنا چاہیے اور کون سا کس وقت اس کی سمجھ رکھنے والے کو فقیہ کہتے ہیں۔اور فقیہ الاھم بالاھم کی رعایت کرتا ہے۔

دین (اوامر الٰہیہ) کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہیے اور کسی بھی منکر کے ارتکاب سے سخت اجتناب کرنا چاہیے۔اللہ نہ کرے اگر کسی منکر پر عمل کرنے میں مسجد و مدرسہ کی حفاظت نظر بھی آئے تو یہ نظر کا دھوکہ ہے۔منکر (گناہ) اختیار کرنا کسی بھی صورت میں دین نہیں کہلائے گا!! منکر کے ارتکاب سے اللہ تعالیٰ کی مدد ہٹ جاتی ہے۔اور جس کام میں سے اللہ کی مدد ہٹ جائے وہ دنیا وآخرت کا بوجھ ہے اور مصیبت کا سبب۔

اس بارے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قابل عبرت واقعہ یاد رکھنا چاہیے۔ جب وہ دارالعلوم کی کمیٹی کے ممبر بنے تو کسی نے مشورۃً ان کو لکھا کہ فلاں بااثر رئیس کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بنالیا جائے، کیوں کہ نہ بنانے کی صورت میں فساد کا خطرہ ہے۔

حضرتؒ نے جواب میں فرمایا کہ اگر عنداللہ مجھ سے سوال ہوا کہ نالائق کو رکن کیوں بنایا؟ تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوگا اور رکن نہ بنانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ضرر ہوسکتا ہے کہ مدرسہ بند ہوجائے گا جس کا میں یہ جواب دے سکوں گا کہ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی جس پر اگر مدرسہ بند ہوگیا تو اس میں میرا کیا قصور؟ حضرت کے اس تقویٰ کا یہ اثر اور نتیجہ ہوا کہ وہ رئیس صاحب مدرسہ کے خلاف چیختے رہے مگر الحمدللہ دارالعلوم مسلسل حیرت انگیز ترقی پر گامزن رہا (تحفۃ الائمہ ۳۱۳ از احسن الفتاویٰ)۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں ہے کہ آج کل دین کے باب میں یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ مبادی کو غایات کا اور ذرائع کو مقاصد کا درجہ دے دیا جاتا ہے!! اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ دین کے تمام شعبوں میں یہ غلطی گھس گئی ہے جو ہزاروں خرابیوں کی جڑ ہے (ملفوظات ۸۸)۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ فرماتے ہیں کہ اہل دین اپنے دینی شعبوں میں مقصد کے حصول کے لیے جو مختلف وسائل وطریقے اختیار کرتے ہیں انہیں اپنے اس کام میں شرعی مقاصد وحقائق کی پوری رعایت کرنی چاہیے اور انہیں اس پر غور کرلینا چاہیے کہ کتاب وسنت سے کیا ثابت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سارا زور وسائل پر لگ جائے اور مقصد کنارہ پر ہوجائے!! انہیں وسائل کے بجائے مقاصد پر زور صرف کرنا چاہیے، جب تک اس پہلو پر توجہ نہ دی جائے گی کما حقہ نہ کمال دین حاصل ہوگا اور نہ مقاصد دینیہ (تزکیہ واحسان ۱۷)۔

اس بارے میں اس حدیث شریف کو ملحوظ رکھنا بھی مفید ہوگا ''عن غُضیفِ بنِ الحارثِ...فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ ''(مشکوٰۃ ۱/ ۳۰)۔پس سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت (حسنہ) کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

صاحب مظاہر حق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کسی سنت کو پکڑنا اور طریقہ نبوی کی پابندی کرنا خواہ اس کی نوعیت وصورت کتنی ہی معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو۔ بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے اگر چہ وہ حسنہ ہی کیوں نہ ہو اور وہ بظاہر کتنا ہی بڑا کام نظر کیوں نہ آتا ہو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کے مدارج جس نور کے ذریعہ طے ہوتے ہیں وہ صرف سنت اور طریق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و پابندی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ بدعت میں پھنسنا اس نور سے محروم ہونا اور ظلمت کو بلانا ہے (مظاہر حق ۱/ ۲۴۴)۔(مزید تفصیل کے لیے کتاب کا مطالعہ فرمائیں آگے عمدہ تفصیل ہے)۔

نیز بعض دفعہ آدمی بذریعہ ''ایجاد حسنہ'' طاعات کے کام انجام دیتا ہے وہ اچھا ہے جب کہ امور شرع کی رعایت سے ہو۔لیکن اگر اس سے عجب وتکبر پیدا ہو اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل ہو تو علمائے اسلام فرماتے ہیں ایسی طاعات سے (جن سے عجب پیدا ہو) ایسی معصیت بہتر ہے جو اپنے کو خطا کار سمجھنے کا باعث وذریعہ ہو!!!۔'' مَعْصِيَةٌ أُورِثَتْ ذُلًّا وَاسْتِحْقَارًا خَيْرٌ مِن طَاعَةٍ أُورِثَتْ عُجْبًا وَاسْتِكْبَارًا (مرقات ۱/ ۱۳۸)۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' کے تحت توحید کامل کی طویل تفصیل بیان کی ہے اور دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے۔مختصر یہ کہ توحید کامل تین توحیدوں کا مجموعہ ہے۔(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت۔

توحید ذات یعنی واجب الوجود اور اس کی ذات کو ایک ماننا۔یعنی الوہیت کے قابل

اسی کو ماننا۔

توحید صفات یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو شریک نہ کرنا۔

پھر دلائل کے بیان میں ذرائع کا ذکر کیا ہے کہ یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس میں ذرائع کی عبادت نہیں ہوتی برخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان میں ایسی کامل توحید نہیں کیوں کہ ان میں غیر اللہ یعنی ذرائع کی بھی عبادت ہوتی ہے جب کہ اسلام میں ذرائع کی عبادت ہے ہی نہیں!!!

آپ سوچیے کہ اگر ذریعہ اور واسطہ کی عبادت اسلام میں جائز ہوتی تو کون سا ذریعہ سب سے بڑا اور اہم ہے جس کی عبادت ہوتی؟ تو امام رازیؒ فرماتے ہیں سب سے بڑا ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادت ہوتی کیوں کہ وہی توحید کامل کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ یہ تو مذہبی ذریعہ کا ذکر تھا۔ اور مادی دنیا میں شاید سورج کی پرستش جائز ہوتی کہ مادی لحاظ سے بڑا ذریعہ وہی معلوم ہوتا ہے۔

اور جب عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جائز نہیں اور (سورج کے) اوقاتِ مکروہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بھی سورج کے پرستاروں کی مشابہت سے بچنے کے لیے مکروہ قرار دیا گیا تو پھر مخلوق میں کس کی عبادت ہو سکتی ہے!!

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر سے آئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تعظیماً سجدہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تعجب سے پوچھا ”مَا ھٰذَا یَا مُعَاذُ“ معاذ یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے دوران سفر عیسائی قوم کو اپنے بزرگوں کی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بڑھ کر تعظیم کا مستحق ہے ہی کون؟ لہٰذا میں نے آپ کو سجدہ کرنا چاہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو

میں عورت کوحکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کوسجدہ کرے۔

آپ کے اس ارشاد میں اصول اسلام کا ایک بہتا دریا نظر آتا ہے! لیکن ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ بیوی (عورت) کی ربوبیت اور پرورش خاوند کے ذمہ ہے۔ مادی بھی روحانی بھی۔ مادی تو نان نفقہ مکان وغیرہ ہیں کہ یہ خاوند ہی کے ذمہ ہیں اور دینی جیسے ارشاد ہے۔ "قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَاراً" (اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) تو گویا خاوند عورت کی دینی ودنیوی ربوبیت کا ذریعہ اور سبب ہے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں حدیث کو اب یوں سمجھئے کہ اگر ربوبیت کا سبب بننے کی وجہ سے کسی کوسجدۂ تعظیمی جائز ہوتا تو شوہر کے لیے جائز ہوتا (یاماں باپ یا بادشادہ کے لیے بھی جائز ہوتا)۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ سجدہ اسباب ربوبیت کے لیے جائز نہیں چاہے وہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر پیروں اور مشائخ کا سجدہ کہاں جائز ہوسکتا ہے (جن کا تو کہیں ذکر بھی نہیں) چاہے زندہ پیروں کا یا ان کے وصال کے بعد ان کی قبروں پر!! (ماخوذ از تفسیر کبیر سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں۔ ج ۱ر ۱۰۴ واز ۲۴۵ تا ۲۵۲)۔ پوری بحث کا خلاصہ یہ کہ آدمی دینی کام میں جو ذرائع بھی اختیار کرے ان میں اس کا خوب دھیان رکھے کہ اللہ کا کوئی حکم ٹوٹنے نہ پائے چاہے اوامر سے ہو کہ نواہی میں سے۔

ائمہ کہیں جائیں تو نائب مقرر کر کے جائیں

امامت چوں کہ اجتماعی نظام کا ایک باوقار عہدہ ہے جس سے پوری قوم منسلک ہے لہٰذا جب امام کسی سفر وغیرہ کا ارادہ رکھے تو اپنی جگہ کسی ایسے شخص کو نائب بنا کر جائے جو عہدۂ امامت کے لائق ہو۔ اپنے عہدہ کا نائب مقرر کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور دنیا کا دستور بھی۔

جب موسیٰ علیہ السلام بحکم الٰہی کوہ طور پر تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو

خلیفہ بنایا اور سب کو اس بات کی ہدایت کردی کہ میرے جانے کے بعد ان کی اطاعت کرنا تاکہ تم میں یہ اختلاف نہ ہو کہ ہم موسیٰ کی غیر حاضری میں کس کی پیروی کریں۔ وہ نائب اصل کے امور کو انجام دے اور اس کے نظم وضبط کو برقرار رکھے (معارف القرآن ۱۰۹/۶)۔

لہٰذا نائب کا کام یہ ہے کہ وہ وقت پر نماز کی جماعت قائم کرے اور لوگوں کی ان کے اعمال مساجد (وضوء، نماز، قراءت اور دعاؤں) میں اصلاح کی فکر کرے اور ان کی پوری تعلیم وتربیت کرے۔ اور جمعہ کے خطاب میں مناسب موضوع منتخب کرکے لوگوں کی دینی ذہن سازی کرے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکۃ المکرمہ سے حنین تشریف لے گئے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مکہ والوں پر امیر بنا کر تشریف لے گئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ مکہ میں لوگوں کو قرآن شریف سکھائیں اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں۔ پھر جب وہاں سے مدینہ واپس جانے لگے تو دوبارہ حضرت معاذ کو مکہ والوں پر نائب مقرر فرمایا (مرقات ۱۵۴/۴)۔ معلوم ہوا کہ ائمہ کو نائب بنائے بغیر کہیں جانا نہیں چاہیے۔

آخیر میں ایک اہم اور خاص صفت : اخلاص

اخلاص کی تعریف: ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اخلاص کسی عمل کو صرف اللہ کی رضا کی نیت سے کرنے کو کہتے ہیں۔ حتی کہ اس کے علاوہ نیت سے کرنے کو اخلاص نہیں کہیں گے چاہے وہ نیت دین کی ہو۔ مثلاً حصول جنت وغیرہ۔ اس تعریف سے گویا اخلاص کی دو قسمیں ثابت ہوئیں۔ (۱) اخلاص خواص۔ (۲) اخلاص عوام۔

(۱) کسی عمل کے اندر نیت صرف اور صرف رضاء الٰہی کی ہو حتی کہ دینی بھی کوئی غرض نہ ہو مثلاً حصول جنت وغیرہ۔ یہ خواص کا اخلاص ہے۔

(۲) کسی عمل کے اندر نیت صرف دین کی ہو دنیوی غرض (مثلاً ریا نمود وغیرہ) نہ ہو البتہ رضاء الٰہی کی نیت موجود نہ ہو۔ یہ بھی اخلاص ہی ہے کیوں کہ اس میں دنیوی غرض فاسد نہیں ہے۔ تاہم پہلے درجہ سے کم کی نیت ہونے کی وجہ سے یہ کم رتبہ کا اخلاص کہلائے گا۔ یہ عوام کا اخلاص ہے۔

اخلاص و ریا کی ایک عجیب تعریف ملاحظہ ہو۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی عمل کو غیر اللہ کے لیے کرنا تو شرک ہے!! اور کسی عمل کو غیر اللہ کی وجہ سے چھوڑنا ریا کاری ہے!! (پہلے کی مثال یہ کہ کسی کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنا، صدقہ دینا اللہ کا ذکر کرنا وغیرہ۔ اور دوسری کی مثال یہ کہ کسی گناہ کو اس لیے چھوڑنا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں اگر کروں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے تو یہ (ترک معصیت وغیرہ) ریا کہلائے گا)۔

اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں مذکورہ نیتوں سے بچا کر عمل کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ "العملُ لِغَیرِ اللہِ تَعَالیٰ شِرْکٌ" ۔ وَتَرْکُ الْعَمَلِ لِغَیْرِاللہِ رِیَاءٌ وَالْاِخْلَاصُ ان یُّخَلِّصَکَ اللہُ مِنْہُمَا۔" (مرقات ۱/۲۷۹)۔

اخلاص کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک زریں مقولہ منقول ہے۔ حضرت کی ذہانت وفطانت کے اقوال واحوال اہل علم خوب جانتے ہیں۔ آپ فرماتے تھے:

(۱) جنہوں نے طلب جنت کے خاطر عبادت کی تو یہ عبادت تاجروں کی عبادت کی طرح ہے (کہ جس طرح تاجر کا مقصد لین دین ہوتا ہے اور منافع حاصل کرنا ہوتا ہے اس طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بدلے جنت حاصل کرنا چاہتے ہیں)۔

(۲) جنہوں نے عذاب دوزخ کے ڈر سے عبادت کی تو یہ عبادت غلاموں کی سی عبادت ہے (کہ غلاموں کو آقا کی بات مانے بغیر چارہ نہیں، ورنہ سزا ہوگی)۔

(۳) جنہوں نے اپنے مولا و پروردگار کی رضاء وخوش نودی کے لیے اور اس کی نعمتوں کے شکرانہ

کے طور پر عبادت کی تو یہ عبادت احرار وآزاد لوگوں کی سی عبادت ہے!! (جن کے پیش نظر نہ دینی غرض ہے نہ دنیوی نہ طلب نہ ڈر صرف رضا مقصود ہے)۔ یہی عبادت سب سے اعلیٰ درجہ کی ہے (مرقات ۳/۱۴۲)۔

حضرت **مفتی محمد شفیع** صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی آیت "اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ (بقرۃ ۱۳۱) اور "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ پہلی آیت میں اسلام اور دوسری میں دین سے مراد اطاعت حق ہے جو تمام آسمانی کتابوں اور شریعتوں کا خلاصہ اور روح ہے۔ اور اطاعت حق خواہشات نفسانی اور اتباع ہوا کو چھوڑ کر ہدایت کی پابندی کرنے کو کہتے ہیں۔

پھر لکھا ہے کہ حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہو کر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس میں ہے۔ اور اس کا فرمان میرے لیے کیا ہے ؟ وہ ایک غلام کی طرح گوش برآواز رہے کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کے کرنے کا حکم ملتا ہے ؟ اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک اس سے راضی ہو اس کا نام عبادت و بندگی ہے!!

اس جذبۂ اطاعت ومحبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے جس کو مقام عبدیت کہا جاتا ہے جہاں پہنچ کر ابراہیم کو خلیل اللہ اور سید الانبیاء کو عبد کا خطاب ملتا ہے علیہم السلام۔ (معارف القرآن ۱/۲۸۷)۔

مخلص کون ہے؟

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا

مخلص کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا مخلص وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپائے جس طرح آدمی اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے۔ کتنی عجیب بات بتائی!۔ ان سے عرض کیا گیا کہ اخلاص کی غایت کیا ہے؟ فرمایا کہ تو اپنی اس تعریف کو ناپسند کرے جو لوگوں کی جانب سے کی جائے (روضۃ الصالحین ۱/۱۴)۔

اخلاص کس سے سیکھیں؟

جب ایک بزرگ نے فرمایا کہ آدمی کو ادب واخلاص چرواہے سے سیکھنا چاہیے؟ تو ان سے پوچھا گیا یہ کس طرح؟ تو انہوں نے فرمایا جب چرواہا بکریوں کے پاس جنگل میں نماز کے وقت پر نماز ادا کرتا ہے تو اس کو اس کا خیال تک نہیں ہوتا کہ یہ میری بکریاں میری تعریف کریں گی۔ اس طرح عامل کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف و برائیوں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی بجالائیں (روضۃ الصالحین ۱/۱۷)۔

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ صرف فرائض کا اہتمام کرتے ہیں اور ضروری سنن رواتب وغیرہ پر اکتفاء کرتے ہیں نوافل وغیرہ زائد عبادتوں کا اہتمام نہیں کرتے ان کا یہ عمل بتلاتا ہے کہ وہ اپنا فریضہ اتارتے ہیں یعنی ان میں ریاکاری کا کوئی خاص جذبہ نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف جو حضرات اشراق واوابین، چاشت وتہجد اور ان کے علاوہ بھی رات و دن کے نوافل وغیرہ ادا کرتے ہیں ان میں البتہ ریاکاری کا خطرہ ہوتا ہے خصوصًا جب کہ وہ ان کو مجمع اور لوگوں کے سامنے ادا کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور اس کی شرعی وجہ بھی ہے کہ جو جتنا اعمال پر کھڑا ہوتا ہے شیطان ان ہی لوگوں پر اپنا زور زیادہ صرف کرتا ہے۔

نیز جو حج کرنے والا ہو بطور خاص عمرہ پر عمرہ کرے، روزہ رکھنے والا ہو بطور خاص نوافل روزے رکھے، اور مال کی خیرات کرنے والا ہو بطور خاص جو خیرات میں مشہور ہو ان

سب میں بھی ریا کاری کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔اور ان دوطبقوں سے زیادہ اجتماعی کوئی کام کرنے والوں میں مثلاً مساجد کے نظام کو سنبھالنے والوں، مدرسہ۔۔۔۔تقریروخطاب۔۔۔ خانقاہ۔۔۔اور کچھ تبلیغ۔۔اور کچھ تصنیف وغیرہ کے کام کرنے والوں میں بھی اس کا احتمال زیادہ ہوتا ہے [1]۔

اخلاص کی علامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی علامت بتائی ہے۔فرماتے ہیں کہ علامہ شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ کہ تم جو کام کررہے ہو، اگر کوئی دوسرا اس کام کو کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آجائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین واجب نہ ہو جیسے مدرسہ ومسجد کا اہتمام، وعظ کہنا، پیری

---

[1] مضمون بالا کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ سب ریا کار ہیں (نعوذ باللہ من ذلک) کسی کی کیا مجال کہ کسی کو ریا کار کہے۔استغفر اللہ۔یہ صرف اصلاح کے لیے بطور احتمال بتایا گیا ہے تاکہ توجہ ہو کیوں کہ صرف ریاء واخلاص کی یا کسی اور صفت کی تقریر کردینے یا لکھ لینے اور پڑھ لینے سے اصلاح کی طرف مکمل توجہ نہیں ہوتی جب تک اس کے مقام اور اس کے اسباب اور اس کے ازالہ کے علاج سے آگاہ نہ کیا جائے۔

ورنہ کس کا کتنا اخلاص ہے وہ ایک باطنی شی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ہاں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں بڑی ہی عجیب بات فرمائی ہے اور واقع میں وہ اس کے حقدار ہیں کہ وہ یہ فرمائیں کیوں کہ ان کو حدیث شریف میں باب علم فرمایا گیا ہے۔''اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا'' وہ یہ کہ ریا کاروں کے ریا والے اعمال کی خبر تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتی البتہ کامل مخلصین (جنھیں ریا کاری سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ پڑا ہو) کو دوسروں کے اخلاص وریا کے اعمال میں تمیز ضرور ہوجاتی ہے وہ لوگوں کے مخلصانہ اور ریا کے اعمال میں فرق محسوس کرلیتے ہیں۔یہ ان کے کامل اخلاص کی برکت ہوتی ہے۔

مریدی کرنا، کسی نیک کام کے لیے چندہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔

بل کہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیجا جس نے تمہارا بوجھ اٹھالیا۔ اگر یہ حالت ہو تو تم واقعی مخلص ہو۔

مگر اب تو حالت یہ ہے کہ اگر کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آئے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلتے مرتے ہیں۔ اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں اور اس کو چھوڑ دیں، سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کسی اور کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بل کہ اخلاص سے مفلس ہو (العلم والعلماء ١٤٠ از التبلیغ ترجیح الآخرۃ ج ٢٠/٢٤٨)۔

اخلاص لانے کا طریقہ

اخلاص حاصل کرنے کے لیے جدو جہد سے کام لینا ہوگا۔ صرف اعمال کر لینے سے اخلاص حاصل نہیں ہوگا۔ پہلے ریا کے جذبہ کو مٹانے کی بھرپور جدو جہد کریں۔ مثلاً:

(١) اعمال اختیار کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتوں کا استحضار کیا جائے اور جن کو دکھانے کے لیے کرنے کا دل میں جذبہ ابھرتا ہے ان کو مردہ خیال کیا جائے۔

(٢) اخلاص پر قبولیت عمل اور اس کی برکت کا اور ریا کی وجہ سے پکڑ وسزا کا تصور کیا جائے۔ اس طرح دل پر بوجھ ڈال کر اخلاص کے حصول کی کوشش کریں۔

(٣) ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے اخلاص کی حقیقت مانگتے رہا کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر چھوٹے بڑے عمل میں کامل اخلاص کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

تمت بالخیر



خاتمۂ کتاب

ہم اولاً ائمہ حضرات کی پوری جماعت کو امامت جیسے عظیم منصب کے حصول پر صد مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ درحقیقت وہ امامت میں نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ اور ان کی اس خدمت کو سو بار سلام کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کریں۔

ایک بات جو فطری اور یقینی ہے اسے ضرور ذہن نشین رکھیں کہ ہر چیز اپنی کچھ وجوہات کی بنا پر ضرور انحطاط و گراوٹ اور کمی کوتاہی کی شکار ہوتی ہے انہی میں سے امامت بھی ہے۔ امامت کے دوران بھی امامت میں انحطاط و گراوٹ پیش آتی ہے جس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ہم انہیں نقشہ میں پیش کرتے ہیں تاکہ اختصار بھی حاصل ہو اور سمجھنا بھی آسان ہو۔

ان وجوہات سے ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ائمہ کو بدنام کرنا ہے یا ان کو لوگوں کی نظروں میں گرانا ہے۔ حاشا وکلا۔ مقصد ائمہ کو انحطاط کے اسباب کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ انہیں جان کر اپنی اصلاح کر سکیں کیوں کہ انہیں جانے بغیر اصلاح ناممکن ہے۔ یہی وہ احوال اور وہ وجوہات ہیں جن کی اصلاح کی طرف مختلف مصنفین نے توجہ دلائی ہے۔ بس اب کام ائمہ کا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ اصلاح کی بات سامنے آئے اسے خیر مقدم کہہ کر قبول کر لیں۔

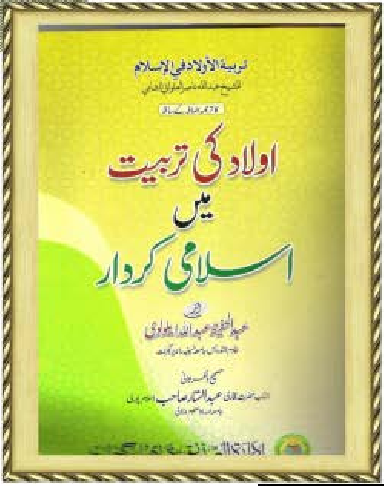
(۱)	بعض ائمہ یقیناً علمی لحاظ سے امامت کے اہل ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۰ / ۲۰ فی صد۔
(۲)	بعض ائمہ یقیناً علمی لحاظ سے امامت کے نااہل ہوتے ہیں۔ مثلاً ۴۰ / ۵۰ فی صد۔
●	بعضوں کی تو قراءت بھی صحیح نہیں ہوتی حتی کہ سورۂ فاتحہ بھی صحیح نہیں ہوتی۔
●	بعضوں کو اہم اہم مسائل کی بھی جانکاری حاصل نہیں ہوتی۔

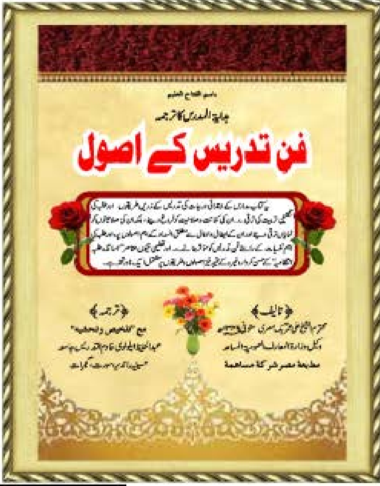
(۳)	بعض ائمہ عملی لحاظ سے امامت کے نااہل ہوتے ہیں۔
●	امامت کے بعد اکثر اوقات لایعنی کاموں میں ضائع کردیتے ہیں۔
(۴)	بعض ائمہ ایسے بےفکروسست ہوتے ہیں کہ نہ اپنی فکر نہ مقتدیوں کی اصلاح کی فکر۔
(۵)	بعض ائمہ امامت سے صرف معاش چاہتے ہیں۔ان کو صرف تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے۔
(۶)	بعض، متولیان کے خوشامدی ہوتے ہیں، خودداری وغیرت سے خالی ہوتے ہیں۔
●	بعض، دوراندیشی ودانشمندی سے کورے ہوتے ہیں۔
(۷)	بعض، ڈرپوک ہوتے ہیں جو نماز پڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرپاتے۔

سوچیے ایسی پوزیشن (حالت) میں کیا منصب امامت قوم ومعاشرے میں کوئی انقلاب لاسکتا ہے!! اس کے برخلاف اگر ائمہ علمی وعملی اہلیت کے حامل ہوں، اس عہدے کی عظمت سے قلب لبریز اور رضاء الٰہی سے وہ منور ومعمور ہو، فکر معاش سے آزاد ہوکر اپنے کردار میں فعال ہوں اور ہر طرح کی اصلاح میں متفکر ہوں اور دوراندیشی ودانشمندی کے حامل ہوں تو یہ منصب قوم وجماعت میں کیسا لاجواب انقلاب پیدا کرے!!

تنبیہ : جو ائمہ علمی اہلیت رکھتے ہیں وہ بھی رواجی امامت کرتے کرتے (بےفکری کی وجہ سے) بتدریج اہلیت کھو بیٹھتے ہیں۔لہٰذا انہیں چاہیے کہ اپنی اہلیت پر حیات طاری رکھیں فکر سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ ان پڑھی لکھی باتوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔آمین۔

مؤلف کی دیگر کتابیں





طلب کے ٹھکانے :

مکتبہ احمدیہ راندیر، سورت	99746 04855
مکتبہ احمدیہ ایلول، سابرکانٹھا	75750 90455
کتب خانہ رشیدیہ چھاپی ہایوے بناس کانٹھا	99041 11938
مفتی رمضانی صاحب، گودھرا، پنچ محل، گجرات	73833 13951
جمعیت علماء دریاپور، احمدآباد	079-22169200
مولانا حمزہ صاحب، دیوا، دارالعلوم، انکلیشور	94284 42151
قاضی بک ڈپو رانی تلاؤں، سورت	0261-2491985
مدرسہ الیاسیہ منگرول پیرواشم (مہاراشٹر)	89755 14144
مولانا محبوب صاحب، ایلولوی، میگنگر (ایم، پی)	88190 56252
مولانا خالد سیف اللہ پالیہ مسجد (بنگلور ۲۱)	96119 38995

Printed By : HIDAYAT ART 9974034310